مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دار المصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے، جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔

"منیجر"

جلد ۱۴۷ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۱ء عدد ۴

مضامین

شذرات

شجاعت، بہادری اور جنگجوئی عربوں کے خمیر میں داخل تھی، زمانۂ جاہلیت کا شاعر غیرت وحمیت سے سرشار ہوکر کہتا ہے:

الا لا یجہلن احدٌ علینا ۔۔۔ فنجہل فوق جہل الجاہلینا

(ترجمہ) ہاں دیکھو! کوئی ہم سے جہالت نہ کرے، ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں

یا حماسی شاعر کے بقول:

قومٌ اذا الشرّ ابدیٰ ناجذیہ لہم ۔۔۔ طاروا الیہ زرافات و وحدانا

(ترجمہ) وہ ایسے بہادر لوگ ہیں کہ جب انھیں سخت جنگ پیش آتی ہے تو وہ سب بلاتوقف اجتماعی وانفرادی طور پر اس میں ٹوٹ پڑتے ہیں۔

لیکن اب وہی عرب عیش وتنعم کے خوگر اور اس حال میں ہوگئے ہیں کہ "نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے" عراق کی فوجی قوت کا بہت شور سنا جاتا تھا، لیکن اس کے ڈھول کا پول کھل گیا وہ کس قدر جوش وخروش سے میدان جنگ میں کودا تھا، مگر اٹھنے سے پہلے ہی گرفتار ہوگیا گو توپ وتفنگ کی جنگ ختم ہوگئی ہے، لیکن اب بھی عراقی باشندوں کے سروں سے جوئے خوں گذر رہی ہے، یہ کیوں؟

مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے سے زیادہ یہودیوں اور عیسائیوں کو انھیں ذلیل ورسوا، فوجی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے کمزور، پسپا اور ذہنی ودماغی اذیت میں مبتلا کر دینے سے دلچسپی رہی ہے، فتح ایوبی کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے اس صدی کی ابتداء ہی میں خلافت کی دھجیاں بکھیر دیں، ترکوں اور عربوں کی سلطنتوں کے جتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرسکتے تھے کر ڈالے، وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کو توڑ پھوڑ کر ذہنی حیثیت سے مرتد کر دیا، عربوں اور فلسطینیوں کے سروں پر اسرائیلی سلطنت مسلط کرکے ان سے قبلہ اول چھین لیا اور ابھی یہ صدی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عراق کو چور چور کرکے رکھ دیا گیا، اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے بعد قربانی کا بکرا کون بنے گا؟

کویت سے عراق کا انخلا تو ایک بہانہ تھا، انگریزوں کی اصل کارروائی اب شروع ہوئی ہے، یہ سمجھنا سادہ لوحی ہے کہ اتحادی صرف عراق کی اینٹ سے اینٹ بجاکر اور دوسرے عربوں پر اپنا دست شفقت پھیر کر خاموش ہوجائیں گے، عہد رسالت سے آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری رہنے والی یہودی ومسیحی سازشوں کو کیوں نظر انداز کردیا جاتا ہے، یہ جس طرح پہلے مسلمانوں کے ہمدرد اور کرم فرما بن کر انھیں تختۂ مشق بناتے رہے ہیں آج بھی اسی طرح کے کرتب دکھانے میں لگے ہوئے ہیں، اور خود عربوں کی روایتی فیاضی ومہمان نوازی کی بدولت ان کے یہ مہمان ان ہی کی سرزمین میں رہ کر انھیں زیر دام کر رہے ہیں، جن پر ایسی غفلت اور خود فراموشی طاری ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قید وبند کی بیڑیوں کو کستے اور مضبوط کرتے جارہے ہیں ؎

پوچھتے کیا ہو دیار دل کی مہماں پروری ۔۔۔ جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہوگئی

رخنۂ دیوارِ زنداں آپ بھر دیتا ہوں میں ۔۔۔ قید میری خود مرے ہاتھوں دوامی ہوگئی

قرآن مجید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے فتنہ پردازوں کے فریب میں نہ آئیں، سورۂ بقرہ میں آدم وابلیس کا قصہ یہ واضح کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح شیطان نے آدمؑ کی مخالفت کی تھی اسی طرح نسب وجاہ کے گھمنڈ اور حسد کی بنا پر یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہیں، اسی سورہ میں یہودیوں کے ایک گروہ کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ بظاہر تو رواداری اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف

نفرت وحقارت کی آگ بھڑک رہی ہے، اس کی اس دھوکہ بازی سے مسلمان اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ وہ ان کے معاملہ میں فراخ دل ہے، کیونکہ یہی گروہ جب اپنے یہودی لیڈروں کے پاس جاتا ہے تو ان کو اطمینان دلاتا ہے کہ ہم آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہیں، ہمارا مقصد تو صرف مسلمانوں کو بے وقوف بنانا ہے، کیا آج بھی مسیحی اسی طرح کی چال بازی نہیں کر رہے ہیں؛ لیکن پھر بھی مسلمان انھیں اپنا ہمدرد سمجھ رہے ہیں، یالیت قومی یعلمون۔

تحزب و اختلاف مسلمانوں کی خصوصیت ہوگئی ہے، وہ کسی مسئلہ میں متفق الرائے ہونا جانتے ہی نہیں، اس کی وجہ سے اصلی اور بنیادی مسئلے کو نظر انداز کرکے وہ جزئیات کے درپے ہو جاتے ہیں، اور غیر ضروری اور فضول بحثوں میں اپنی قوت و توانائی ضائع کر دیتے ہیں، انگریزوں کی شاطرانہ سیاست نے ہمیشہ اصل حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے بجائے انھی ضمنی مسائل میں انھیں الجھائے رکھا ہے، کویت اور عراق کے معاملہ میں بھی ہر جگہ مسلمانوں کے دو گروہ ہوگئے ہیں، ہندوستان میں بھی ان دونوں کی کشمکش نے مسئلہ کی صحیح صورت حال لوگوں پر واضح نہیں ہونے دی ہے، اصل اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہودی و عیسائی سازش کا شکار صدام حسین ہی نہیں عرب حکمراں بھی ہوئے ہیں، یہ حقیقت ہے چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، اس لیے صیاد خوش ہے کہ باہمی کشمکش نے عنادل کو اپنے آشیانوں سے بے فکر کر دیا ہے، اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ عالم اسلام میں ہونے والی مسیحی سازش کو سمجھ کر مسلمان اس کے تدارک کی فکر کریں۔

اترپردیش کی حکومت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو جس قدر زور و شور سے اٹھایا اس نے پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت بہت بڑھا دی اور یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے مزید پیچیدہ ہوگیا، یہی نہیں بلکہ دوسرے اہم قومی و ملی مسائل اس کی وجہ سے بالکل نظر انداز ہوگئے، اردو کا مسئلہ اس طرح دبا دیا گیا کہ اب اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا، حکومت نے ہندی کا بول بالا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن ایک سیکولر اور قومی زبان کے معاملہ میں اس کی خاموشی اور غفلت ناقابل معافی جرم ہے، آنے والے انتخابات میں اردو والوں کو اپنی زبان کو اولین اہمیت دینی چاہیے۔

مقالات

مولانا آزاد کی تفسیر قرآن مجید کے امتیازات

از

(پروفیسر ریاض الرحمن شروانی سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)

قرآن مجید کی تفسیر و تعبیر کا سلسلہ اسکے نزول کے بعد ہی سے شروع ہوگیا تھا کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی بہترین عملی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تھی آپکے وصال کے بعد بعض صحابۂ کرام خصوصیت سے فہم قرآن مجید میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نام نمایاں ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا ایسے ایسے قرآن مجید کی تفاسیر کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ تفاسیر عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی لکھی جانے لگیں۔ یہاں ان سب تفاسیر کا جائزہ لینا مقصود نہیں، عرض یہ کرنا ہے کہ ان تفاسیر کا رنگ و آہنگ جدا جدا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید کا فکری محور اس قدر وسیع ہے کہ اس سے ہر ذوق و وجدان کا شخص اپنے اپنے طور پر لطف اٹھاتا اور بصیرت و آگہی حاصل کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف لوگوں نے قرآن مجید کی تفسیر مختلف نقطۂ

نظر سے لکھی ہیں کسی نے اس میں فلسفہ و منطق کی گتھیوں کا حل دیکھا ہے، کسی نے اس کی روشنی میں تاریخ و اساطیر کے واقعات کا کھوج لگایا ہے، کسی نے قواعد و لسانیات کے مسائل اس کی مدد سے حل کیے ہیں، کسی نے سیاسیات و عمرانیات کے اصول اس کے ذریعہ سمجھے ہیں اور کسی نے روزمرہ کی زندگی کا لائحۂ عمل اس میں تلاش کیا ہے جب عرب اپنے جغرافیائی حدود سے نکل کر دنیا کے دوسرے ملکوں اور علاقوں میں پھیلے تو وہ ایک وسیع تر خطۂ ارض ہی کے مالک نہیں ہوئے بلکہ ان ملکوں کی علمی وراثت بھی انکے حصے میں آئی اور وہ قدرتی طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر کی جھلکیاں قرآن مجید کی مختلف ادوار اور مختلف علاقوں کی تفسیروں میں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ کبھی یونانی فلسفہ و منطق کا اثر ان میں نظر آتا ہے، کبھی اسرائیلی روایات کی جھلک ان میں ملتی ہے اور کبھی جدید مغربی فکر کے آثار ان میں محسوس ہوتے ہیں۔ جدید مغربی فکر کے ضمن میں یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ اب معاملہ اس لحاظ سے برعکس ہو گیا تھا کہ مسلمان حاکم نہیں رہے تھے بلکہ محکوم ہو گئے تھے اور اس لیے اپنے آقاؤں کی فکر سے مرعوبیت کا عنصر اس میں شامل ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان میں سے بعض نے بعض ایسے امور میں جو عقل انسانی سے ماوراء تھے اپنی تفسیروں میں معذرتی انداز اختیار کیا۔

قرآن مجید نے انسانی فکر پر پابندیاں نہیں عائد کی ہیں بلکہ انسانوں کو اس سے کام لینے پر اکسایا اور آمادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر دور اور ہر علاقے کے انسان کی فکر ایک جیسی نہیں ہو سکتی اور اس اعتبار سے قرآن مجید کی تفسیر و تعبیر میں اختلافات ناگزیر ہیں لیکن ساتھ ہی کثرت میں وحدت کی جلوہ گری قائم رکھنے اور انتشار فکر کی راہیں مسدود کرنے کی خاطر علمائے اسلام نے یہ اصول وضع کیا کہ خود قرآن مجید کے

طرز فکر اور اسلوب ادا کو معیار بنا کر اس کے معانی و مطالب حل کیے جائیں تاکہ تفسیر بالرائے کا امکان باقی نہ رہے۔ تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے اس بارے میں بھی خاصہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئیں تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن مجید کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے یا اس کی تفسیر کرنے میں عقل و درایت کو دخل نہ دیا جائے کیوں کہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن مجید کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ قرآن مجید کا یہ حال ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷ : ۲۴) تفسیر بالرائے میں "رائے" بمعنی لغوی نہیں بلکہ "رائے" مصطلحۂ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اسلیے نہ کی جائے کہ خود قرآن مجید کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن مجید کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

آگے چل کر مولانا نے اس کی وضاحت کی ہے کہ مختلف مکتبہائے فکر کے مفسرین نے مختلف ادوار میں قرآن مجید کی تفسیر بالرائے کس کس طرح کی ہے اور اس سے کیا کیا کام لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے آیات محکمات و متشابہات کے مسئلے کو جس نے بہت سے دماغوں کو مضطرب کر رکھا ہے، اس طرح حل کیا ہے کہ وہ تفسیر قرآن مجید میں ممد و معاون ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سب امور جو

محسوسات سے تعلق نہیں رکھتے اور ذہن انسانی کی گرفت سے ماوراء ہیں متشابہات کے حکم میں داخل ہیں۔ مولانا کی رائے ہے کہ قرآن مجید کو اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح اس کے اولین مخاطبین نے سمجھا تھا، نہ کہ اس طرح جس کا سانچہ، بقول انکے تمدن کے وضعی اور صناعی عوامل نے ڈھال دیا تھا۔ انکا ارشاد ہے:

"قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب اپنے طریق استدلال، غرض کہ اپنی ہر بات میں دنیا کے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں اور نہ اسے ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے طریق ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ قرآن مجید جب نازل ہوا تو اسکے پہلے مخاطبوں کا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا اور فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید اپنی شکل و معنی میں جیسا کچھ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں بس گیا۔ اور اسے قرآن مجید کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی بھی دشواری نہیں محسوس ہوئی۔۔۔ لیکن صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن مجید کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں ناآشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وقت آ گیا کہ قرآن مجید کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اسلیے طرح طرح کے الجھاؤ

بڑھتے گئے۔"

اس نسبتاً طویل اقتباس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد قرآن مجید میں تدبر و تعقل کے پوری طرح قائل ہیں لیکن دوسری طرف اس کی تعبیر و تشریح کو وضعیت و صناعیت سے پاک رکھ کر اسے اسکی بنیادی فطرت کے مطابق سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے قرآن سے اس پر استدلال کرنے کی کوشش کے قطعاً مخالف ہیں۔ وہ عقل و درایت سے کام لینے پر ضرور زور دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی عقل انسانی کے حدود سے ناواقف نہیں، اس لیے وہ متشابہات میں عقلی بازی گری سے محترز رہنے کو بھی اتنا ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ عدل و توازن ہر میدان میں مولانا آزاد کی شخصیت کا خصوصی جوہر ہے اور اس سے تفسیر قرآن مجید بھی مبرا نہیں ہے۔

مولانا آزاد کے سامنے تفسیر قرآن مجید کا ایک وسیع لائحہ عمل تھا لیکن زندگی کے دوسرے مطالبات، خصوصاً جہاد حریت کی گرم بازاری نے انہیں اس لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کی مہلت نہیں دی۔ ان کا منصوبہ تھا کہ قرآن مجید کے درس و مطالعے کو تین کتابوں میں منقسم کر دیا جائے: مقدمۂ تفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن۔ افسوس ہے کہ اس منصوبے کی پہلی دو کڑیاں معرض وجود ہی میں نہیں آئیں اور تیسری کڑی بھی ہماری نظروں کے سامنے نامکمل صورت ہی میں آ سکی۔ دراصل "ترجمان القرآن" قرآن مجید کی مکمل تفسیر نہیں ہے بلکہ اسے توضیحی ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ بات خود مولانا آزاد نے کتاب کے پیش لفظ میں واضح کر دی ہے۔ البتہ سورۂ فاتحہ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس سورت کو مولانا

غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اسے پورے قرآن مجید کا اجمال یا "قدرتی مقدمہ" بتاتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اس سورت کا صرف توضیحی ترجمہ شایع نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مجوزہ تفسیر کا ملخص بھی شامل کر دیا ہے۔ ایسا انھوں نے اس لیے کیا ہے کہ بقول ان کے "ضروری تھا کہ کم از کم یہ مقدمہ تلاوت ترجمہ سے پہلے ذہن نشین ہو جائے"۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر مولانا کا تفسیری شاہکار ہے۔ اس میں انھوں نے قطرے میں دریا کی روانی جس طرح دیکھی اور دکھائی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اگر اسی نہج پر پورے قرآن مجید کی تفسیر تکمیل ہو جاتی تو یہ کتنا بڑا کام ہوتا اسے سمجھنا دشوار نہیں۔ بہر حال قدرت کو یہ منظور نہیں تھا تاہم اب بھی جو کچھ جس صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے امتیازات سے سیر حاصل بحث ایک مختصر مقالے میں ممکن نہیں بلکہ ایک تفصیلی کتاب کی متقاضی ہے۔ اس لیے یہاں تفسیر سورۂ فاتحہ کا نسبتاً تفصیلی جائزہ لیا جائے گا اور بعض دوسری سورتوں کی تفسیر کی طرف محض چند اشارے کیے جائیں گے۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو نمایاں کیا گیا ہے وہ ربوبیت رحمت اور عدالت ہیں۔ اس میں خدا کی حمد، صرف اسی کی عبادت اور اسی سے استعانت کا عہد ہے اور سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت طلب کی گئی ہے، ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کا جو اس کے غضب کے مستحق ٹھہرے اور گم راہ ہوئے۔ مولانا آزاد نے ان سب امور پر اتنی شرح و بسط اور اس قدر بصیرت و دیدہ وری سے بحث کی ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ ملتی ہو۔ ابتدا میں یہ بتا دیا ہے کہ خدا کی صفات

کا ٹھیک ٹھیک تصور، قانون مجازات کا اعتقاد، معاد کا یقین، فلاح و سعادت کی راہ اور اس کی پہچان یہ چار ایسی باتیں ہیں جنھیں دین حق کا ماحصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ صفات باری کے ذیل میں کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ "انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں"۔ دراصل شرک کی بنیاد بیشتر صفات الٰہی کا غلط تصور یا پھر اس کی کسی صفت کو مجسم کر کے معبود مان لینا ہی ہوتی ہے ورنہ مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ "خدا پرستی انسانی فطرت کا خمیر ہے.... اسکی فطرت کے لیے سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی بات یہی ہے کہ خالق کائنات کا اقرار کرے"۔ انسانی فطرت کا یہ کتنا صحیح تجزیہ ہے جس سے روگردانی فطرت کی کجی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آگے چل کر انسان کی اس بنیادی غلطی کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے "خدا کے تصور.... کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنا لیا تھا۔ وہ خدا سے ڈرتا تھا لیکن اس سے محبت کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا"۔ اور پھر یہ قابل ستایش نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ

> "سورۂ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ (الحمد) نے اس بنیادی گمراہی کا ازالہ کر دیا اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوئی۔ حمد ثناء جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناء جمیل اسی کی کی جا سکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہوگی وہ خوفناک نہیں ہو سکتی"۔

"مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں جزا و سزا کا تصور پنہاں ہے، جس سے ذہن اللہ تعالیٰ کی قہاری و جباری کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کی توضیح جس

انداز میں کی ہے وہ اس قہر و جلال کا رشتہ عدل و انصاف سے جوڑ دیتا ہے۔ فرماتے ہیں: "جزا و سزا کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا و سزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو"۔ اسی ضمن میں مزید کہتے ہیں کہ "اگر کائنات ہستی میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے"۔ اس آخری جملے پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ نظام حیات کی درستی کا گر کتنے اختصار لیکن بالغ نظری سے بیان کر دیا ہے۔ عدل کو منافی رحمت سمجھنے سے معاشرے میں کیا بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور اسے عین رحمت تسلیم کرنے سے معاشرے کی کس طرح اصلاح ہو جاتی ہے۔

خدا کی صفات کے غلط تصور کے علاوہ ایک دوسری چیز جس نے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیا، پیشوایان مذاہب کی شخصیت کا معاملہ ہے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں غلو نے پیروایان مذاہب کو توحید کے دائرے سے نکال کر شرک کی سرحد میں داخل کر دیا۔ مولانا کہتے ہیں کہ "یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں عظمت کی شان نہ پیدا ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے"۔ گویا معاملہ وہی عدل و توازن کا ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا اسلام کا رویہ اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

"اس بارے میں قرآن مجید نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے:

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجہ رسالت کا اقرار اسلام کی اصل و اساس بن جائے۔ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے"۔ گویا دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے خدا کی توحید کے ساتھ ساتھ نہ صرف پیغمبر اسلامؐ کی رسالت بلکہ آپ کی عبدیت کا بھی اعتقاد لازمی شرط قرار پائی۔

مولانا آزاد نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تینوں صفات یعنی ربوبیت، رحمت اور عدالت کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے جو قرآن مجید کا حقیقی منشا ہے اور جس کے مطابق اللہ تعالیٰ رب المسلمین نہیں بلکہ واقعی رب العٰلمین کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر صفت کے بارے میں ایسے نکات بیان فرمائے ہیں جو ان سے پہلے شاید ہی کسی کے ذہن میں آئے ہوں۔ اس کی ربوبیت ربوبیت عامہ ہے جو ظاہر و باطن دونوں پر حاوی ہے، اس کی رحمت رحمت کاملہ ہے جو

سارے عالم کا احاطہ کرتی ہے اور جس میں اپنے پرائے کی تمیز نہیں ہے وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی یعنی رحمت کی صفت اس میں محض عارضی نہیں، دائمی ہے اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے"۔ مولانا کہتے ہیں کہ "قرآن مجید خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام تر رحمت ہی ہے"۔ مولانا نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے مختلف رموز کو اس طرح آشکار فرمایا ہے کہ وہ چیزیں بھی جو بظاہر اس کے دائرے سے باہر محسوس ہوتی ہیں سمٹ کر اسی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مولانا نے اللہ تعالیٰ کی صفت عدالت کو جو جیسا کہ مذکور ہوا، جزا و سزا کے قانون سے متعلق ہے نظام کائنات کا حصہ بنا کر دکھایا ہے، مولانا کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: "کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے، ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلے سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لیے قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں، معنوی موثرات سے روح متاثر ہوتی ہے اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنھیں جزا و سزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے"۔ مولانا اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو، جیسی کہ وہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں، انسانی ذہن کے سلسلۂ ارتقا کا نقطۂ عروج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے اور ان ہی

سے اس سلسلے کی بدایت و نہایت معلوم کی جا سکتی ہے: (۱) تجسیم سے تنزیہہ کی طرف (۲) تعدد و اشراک سے توحید کی طرف (۳) صفاتِ قہر و جلال سے صفات رحمت و جمال کی طرف۔ اس ضمن میں مولانا نے ان صفات الٰہی سے متعلق مختلف مذاہب عالم اور مختلف فلاسفہ کے طرز فکر سے سیر حاصل بحث کی ہے اور کہیں عدل و توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

اسی طرح قرآنی اصطلاحات ہدایت، صراط مستقیم، مغضوب علیہم اور ضالین سے متعلق مولانا کی تفسیر میں ایسا مواد ملتا ہے جیسا کہیں اور نہیں ملتا ہے۔ اس کا بنیادی نقطہ پیغام الٰہی کی آفاقیت ہے جو زمانوں، تمام قوموں اور تمام حالتوں کو اپنے دائرے میں گھیر لیتی ہے۔ مولانا دین کی وحدت کے قائل ہیں۔ اس معاملے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے وحدت دین کو وحدت ادیان سے خلط ملط کر دیا ہے۔ وحدت دین کا مطلب مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ "وحی الٰہی کی وہ عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ ۔ ۔ وہ سب کے لیے ہے اور سب کو دی گئی ہے اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے"۔ میرے خیال سے مولانا کے وحدت دین کے تصور کا ادراک کرنے کے لیے یہ عبارت بہت کافی ہے اور اس کی موجودگی میں کسی مغالطے کی گنجائش بالکل باقی نہیں رہتی ہے۔

مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر دو اعتراض

مولانا آزاد کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر دو اعتراض بہت شدت سے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اسلام کے نظام عبادت

کو اہمیت نہیں دی گئی ہے یا اسے ہنگامی ٹھہرایا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ اسکے مطابق مولانا کے نزدیک نجات کے لیے ایمان بالرسل ضروری نہیں، صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کافی ہے۔ مولانا آزاد نے ان دونوں الزاموں کی تردید فرمائی ہے لیکن ان کی تردید سے قطع نظر اگر ہم خود تفسیر سورۂ فاتحہ کی اندرونی شہادت پر توجہ دیں تب بھی مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مولانا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے تحت تحریر فرماتے ہیں: "عبادت کے لیے یہ نہیں کہا کہ نَعْبُدُکَ بلکہ کہا اِیَّاکَ نَعْبُدُ یعنی یہ نہیں کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ اور پھر اس کے ساتھ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر استعانت کا بھی ذکر کر دیا اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں۔" اسلام کا نظام عبادت اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ صرف ایک کے سامنے سر جھکانا اور صرف ایک سے مدد مانگنا اور کسی کے سامنے نہ جھکنا اور نہ دست سوال دراز کرنا۔ اس مسئلے سے مولانا نے تفسیر سورۂ فاتحہ کے آخر میں مزید بحث کی ہے۔ اس کا لب لباب بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔

دوسرا اعتراض بھی کم نظری پر مبنی ہے کیونکہ جس طرح قرآن مجید کی ہر سورت کا ایک موضوع ہے اسی طرح سورۂ فاتحہ کا بھی ایک موضوع ہے۔ یہ موضوع اللہ کی حمد، اس کی صفات کا بیان اور اس سے راہ ہدایت کی استدعا ہے۔ اس میں رسولوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ یہ ذکر قرآن مجید کی جن سورتوں میں آیا ہے انکی تفسیر میں مولانا نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے تاہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا مطالعہ بھی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

وہ (قرآن مجید) کہتا ہے خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے، پھر اگر تم کسی ایک پیغام کی تصدیق کرتے ہو، دوسروں کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا ماننا نہیں بلکہ ایک زیادہ بُرے قسم کا انکار ہے۔" کیا یہ عبارت نجات کے لیے ایمان بالرسل کو صاف صاف ضروری نہیں ٹھہراتی ہے اور کیا اس میں نبی آخرالزماںؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہرتا ہے؟ مولانا نے جہاں اس اعتراض کا جواب دیا ہے وہاں لکھا ہے کہ "اگر ایک یہودی حضرت موسیٰؑ کی سچی تعلیم پر عمل کرنا چاہے گا یا ایک مسیحی حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہوگا تو اسے ٹھیک یہی راہ اختیار کرنی پڑے گی جو قرآن مجید نے واضح کر دی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔" کیا اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ مولانا پیغمبر اسلامؐ کو سلسلۂ رسل کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں اور ان کا وحدت دین کا تصور یہ ہے کہ سب ادیان کا خلاصہ وہی دین ہے جس کی طرف قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔ وہ دین کی وحدت کے ساتھ شرع و منہاج کے اختلاف کو ناگزیر بتاتے ہیں اور اس کو ادیان عالم میں اختلاف کا موجب گردانتے ہیں لیکن شرع و منہاج کی ارتقائی شکل اسلامی شریعت کو تسلیم کرتے ہیں۔

بلاشبہ مولانا آزاد کا اصلی اصرار توحید پر ہے اور توحید پر اصرار تمام ادیان کا مشترک پیغام رہا ہے اگرچہ بعد میں آنے والوں نے اسے مسخ کر دیا۔ اسلام توحید کے معاملے میں کسی سمجھوتے پر تیار نہیں ہے اور اس کا توحید کا تصور ہر آمیزش

سے مبرا ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں: "وہ (قرآن مجید) نظام ربوبیت سے توحید الٰہی
پر استدلال کرتا ہے۔ جو رب العالمین تمام کائناتِ ہستی کی پرورش کر رہا ہے۔
اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔
اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے سامنے
جھکایا جائے" یہ بات نہ صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر بلکہ پورے ترجمان القرآن میں
مختلف مواقع پر مولانا نے بار بار مختلف انداز میں بیان کی ہے اور اس طرح بیان
کی ہے کہ اگر پڑھنے والے کا دل کھوٹ سے پاک ہے تو وہ اس میں پوری طرح جاگزیں
ہو کر جزو حیات بن جاتی ہے۔

مولانا آزاد جمال فطرت کے دل سے معترف و مداح ہیں۔ انھوں نے قرآن
مجید میں اس جمال کی عکاسی پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اس کے
ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو تعمق
فکر کے ساتھ حسن ادا کا بھی طلب گار ہے اور یہاں مولانا کے اسلوب کی رعنائی و
زیبائی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ لکھتے ہیں:

"کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت
پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن و رعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ
ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور
اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت
اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور
دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے

اجسام اور ان کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں
پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا
جلوۂ محجوب، غرض کہ تمام تماشاگاہِ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی
جلوہ گاہ ہے ... روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ حسن و رعنائی کے وہ عناصر
ہیں جن سے مشاطۂ فطرت چہرۂ وجود کی آرائش کر رہی ہے"۔

پھر مولانا کو احساس ہوتا ہے کہ کائنات ہستی میں "قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے
ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا بھی موجود ہے" اور اس سے لوگ دھوکا کھا جاتے
ہیں کہ یہاں صرف حسن و زیبائش ہی نہیں، بد ہیئتی و بد صورتی بھی موجود ہے۔ یہاں
مولانا آزاد کی نغمہ و موسیقی کے ساتھ دلچسپی اور اس میں ان کی مہارت رونما ہوتی
ہے اور وہ لکھتے ہیں: "تم بھول جاتے ہو کہ ارغنونِ ہستی کا نغمہ کسی ایک ساز سے
نہیں بنا ہے اور نہ بننا چاہیے تھا۔ جس طرح تمہارے آلاتِ موسیقی کے پردوں
میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں اسی طرح ساز فطرت کے تاروں
میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سر بھی ہیں
جن سے باریک اور سریلی صدائیں نکلتی ہیں۔ موٹے سے موٹے سر بھی ہیں جو بلند
سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سروں کے
ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی موسیقی کی حلاوت ہے کیونکہ دنیا کی تمام
چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج و تالیف سے
پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک ہی سر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے۔
اگر تم بین یا ستار اٹھا کر صرف اس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دو گے یا

پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگو گے تو یہ نغمہ نہ ہوگا، بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز ہوگی۔ یہی حال موسیقی فطرت کے زیر و بم کا بھی ہے۔ تمھیں کوے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی لیکن موسیقی فطرت کی تالیف کے لیے جس طرح قمری و بلبل کا سر ضروری تھا اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا آتار سمجھو اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ"۔ شاید ہی قرآن مجید کی کسی دوسری تفسیر میں موسیقی کے رموز اس طرح بیان ہوئے ہوں اور ان کا رشتہ جمال فطرت سے اس طرح استوار کیا گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد کی تفسیر کی روشنی میں قرآن مجید کی جمالیات پر پورا مقالہ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ دوسرا موضوع ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے علاوہ ترجمان القرآن کے دوسرے حصے بھی مولانا آزاد کے تعمق فکر، فہم قرآن مجید اور حسن ادا پر شاہد عادل ہیں۔ یہاں ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں، صرف تین سورتوں کی تفسیر کی طرف بعض اشارے کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یہ تینوں سورتیں توبہ، یوسف اور کہف ہیں۔ سورۂ توبہ کی تفسیر میں کئی ایسے امور زیر بحث آئے ہیں جو مہمات امور میں داخل ہیں مثلاً جہاد، جزیہ، احکام زکوٰۃ اور اسلام کا اقتصادی نظام۔

اس سورت میں جہاد کا ذکر فتح مکہ کے بعد کے دور سے تعلق رکھتا ہے، اسکے بارے میں مولانا کا کہنا ہے کہ یہ حکم صرف ان کفار مکہ کے خلاف تھا جنھوں نے بدعہدی کی اور ظلم و تشدد کا راستہ اختیار کیا، نہ کہ عام کفار کے خلاف اور پھر "ارشاد و موعظت کا دروازہ اول الذکر کے لیے بھی کھلا رکھا گیا" اور دین و اعتقاد کے معاملے کو

جبر و اکراہ کے شبہے سے بھی بالاتر رکھا گیا"۔ اگرچہ یہ آیات ایک خاص موقع سے تعلق رکھتی ہیں تاہم ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد کا اصلی مقصد بدعہدی اور ظلم و تشدد کا خاتمہ اور عبرت پذیری کا موقع فراہم کرنا ہے، نہ کہ تبلیغ اسلام یا قیام حکومت۔

جزیہ وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلم رعایا اسلامی حکومت کو ادا کرتی تھی۔ جزیے کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس سے سب سے اچھی بحث مولانا شبلی نعمانیؒ نے کی ہے جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جزیہ ان تندرست اور جوان غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا جو فوجی خدمت سے استثنیٰ چاہتے تھے۔ سورۂ توبہ میں اس سلسلے میں یہ آیت ملتی ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ہ مولانا نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر جزیہ دیدیں اور ان کا گھمنڈ ٹوٹ چکا ہو"۔ پھر تشریح فرمائی ہے: "نہ صرف عربی زبان میں بلکہ تقریباً ہر زبان میں یہ محاورہ موجود ہے کہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے دیدینا یا رضامندی سے دینا ہوتا ہے ..... پس مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کر لیں اور ان کا گھمنڈ اور ظلم، جس نے انسان کے امن و راحت کو خطرے میں ڈال دیا تھا، باقی نہ رہے"۔ یہاں "عَنْ يَّدٍ" کی تفسیر میں رضامندی اور خوشی کی شمولیت اور "صٰغِرُوْنَ" کی تفسیر میں گھمنڈ کے ساتھ ظلم کے ازالے کی طرف اشارے نے جو معنویت پیدا کر دی ہے اور معاملے کو جتنا خوشگوار بنا دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ جزیہ غیر مسلموں پر کیوں عائد کیا گیا اس بارے میں مولانا آزاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے ہم خیال ہیں یعنی یہ ان غیر مسلموں کے لیے تھا جو جنگی خدمات میں شریک نہ ہونا چاہیں۔ ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ

غیر مسلموں سے بہت زیادہ تھا اور اس اعتبار سے جزیہ ان کے لیے رعایت تھی، نہ کہ زیادتی۔ یہاں یہ امر ضرور ملحوظ نظر رہنا چاہیے کہ اس طرح کی تفریق، خواہ وہ کسی فریق کے حق میں ہو یا اس کے خلاف، ایک مذہبی ریاست میں تو ممکن ہے کوئی سیکولر اسٹیٹ نہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے اور نہ اس میں وہ مباح قرار دی جا سکتی ہے،

مولانا زکوٰۃ کے اجتماعی نظام پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے لیے اسلامی حکومت کا وجود ضروری نہیں بلکہ ایک ایسے معاشرے میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں یہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ:

"اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا جس کا قیام امام و سلطان کی موجودگی پر موقوف تھا تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے؟ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیئے تھے کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کر لیں یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہو جائیں"؟

غور فرمائیے کہ اگر آج اس ملک میں مسلمان زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کر لیں تو ان کے کتنے اقتصادی مسائل کس حسن و خوبی سے حل ہو جا سکتے ہیں! مولانا نے زکوٰۃ کا اصلی مقصد یہ بیان کیا ہے کہ "دولت سب میں پھیلے، سب میں بٹے، کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری نہ ہو جائے"۔ پھر اس مفہوم کی بعض آیات اور بعض احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی روح دولت کے احتکار و اختصاص کے خلاف ہے۔ یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری میں آ جائے

یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو دولت کو خزانہ بنا بنا کر جمع کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دولت ہمیشہ سیر و گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ تمام افراد قوم میں پھیلے اور منقسم ہو"۔

مولانا نے قرآن مجید کے اس اقتصادی نظام سے تقسیم ترکہ اور حرمت سود کا رشتہ جوڑا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں: "قرآن مجید و سنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہو گیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشے میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار و اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے"۔ اسی لیے مولانا کے نزدیک اسلام اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس وہ سوشلزم کو ایک خاص حد تک اسلام کے نظام معیشت سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں البتہ ان کا خیال ہے کہ "معیشت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی اور یہ عدم یکسانیت اکثر حالتوں میں قدرتی ہے کیونکہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں اور جب استعداد یکساں نہیں تو ناگزیر ہے کہ جد و جہد معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں۔ بہ الفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے کہ جو جس قدر حاصل کر سکتا ہے وہ اسکا ہے"۔ یہاں اسلام اور سوشلزم کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، مولانا کی رائے ہے کہ اسلام اور سوشلزم کچھ دور تک ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں جب کہ اسلام اور سرمایہ داری کا ساتھ چند قدم بھی نہیں رہ سکتا۔

سورۂ یوسف میں کئی ایسے امور زیر بحث آئے ہیں جو حیات انسانی میں بہت

اہمیت کے حامل ہیں اور جن سے انسانی کردار کے مختلف گوشوں پر بڑی معنی خیز روشنی پڑتی ہے۔ انسانی سیرت کے زشت و خوب دونوں پہلو اس سورت میں نہایت وضاحت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف حسد، سازش، فریب، ظلم، ہوس، الزام تراشی، دعوت معصیت، دھمکی اور بدگوئی جیسی برائیوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے تو دوسری طرف صبر، استقامت، یقین، عصمت و پاکی، عفو و درگذر، فہم و تدبر، دانش و حکمت، وفا کیشی، حق پسندی و راست بازی، فضیلت علم اور جود و سخا جیسے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حضرت یوسفؑ کے قصے میں پوشیدہ رموز کو عین منشائے قرآنی کے مطابق آشکار کیا ہے اور ساتھ ہی قرآن مجید کے معانی و مطالب کی وسعت، بیان وقایع میں ایجاز بلاغت، دقت بیان اور معجزانہ اسلوب کو نہایت حسن و خوبی سے واضح کیا ہے۔ نیز اس قصے کے ضمن میں تورات اور قرآن مجید کی تصریحات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں، صرف دو اقتباسات دیے جانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پہلے اقتباس کا تعلق قصے کے اس حصے سے ہے جس میں عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسفؑ کو معصیت پر آمادہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ اس سے دامن کشاں نکل جاتے ہیں۔ اس کشمکش میں ان کا کرتا پھٹ جاتا ہے۔ اس دوران عزیز مصر وہاں آپہنچتا ہے اور اس کی بیوی الٹا حضرت یوسفؑ پر الزام لگاتی ہے کہ وہ اس کے بارے میں بری نیت رکھتے تھے۔ حضرت یوسفؑ قدرتاً اس الزام سے برأت کا اعلان کرتے ہیں۔ خود اس عورت کے کنبے والوں میں سے ایک شخص مشلے کا یہ حل بتاتا ہے کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو قصور وار یوسفؑ ہیں اور اگر پیچھے

سے پھٹا ہوا ہے تو عورت جھوٹ بول رہی ہے، قصور اسی کا ہے۔ کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا نکلتا ہے اور عزیز مصر عورت سے کہتا ہے "کچھ شک نہیں یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں"۔ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ عبارت ایک خاص واقعے سے تعلق رکھتی ہے اور وہ بھی ایک انسان کا قول ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا، قرآن مجید نے تو اسے محض دہرا دیا ہے۔ اس کے باوجود اس قول کو اس طرح پیش کیا جاتا رہا ہے گویا یہ قرآن مجید کی عورت ذات کی مکاری پر شہادت ہے۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: "عزیز کے اس قول میں کہ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿﴾ جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے، نہ کہ دنیا جہاں کی تمام عورتوں کے لیے اور پھر جو کچھ بھی ہے عزیز کا قول ہے، خود قرآن مجید کا حکم نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولے کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لیے یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے اور اس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکار اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہشیار ہے.... حالانکہ نہ تو قرآن مجید کا یہ حکم ہے، نہ عزیز کا قول ایسے محل میں ہے کہ اطلاق و عموم کے یہ سوالات پیدا ہوں۔ بحث و تفسیر کی یہ پوری عمارت بنیاد سے لے کر چوٹی تک بالکل بے اصل ہے"۔ مولانا اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آگے لکھتے ہیں: "بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں لیکن قرآن مجید کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے

وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر کی بیوی کی منشاء نہ پوری کرنے کے جرم میں قید و بند کی مصیبت بھگتنی پڑی۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے اس نے اس واقعے کی عظمت کتنی بڑھا دی ہے یہ نکتہ مولانا آزاد سے قبل کوئی دوسرا مفسر اس طرح پیش نہیں کر سکا تھا! ارشاد فرماتے ہیں:

"دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو روک نہیں سکتے لیکن اب حضرت یوسفؑ کے سامنے قید کی سزا اسلیے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے کو روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ کو اس لیے قید خانے کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ عیش حیات نے ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی، انھوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔"

سورۂ کہف کی تفسیر مولانا آزاد کی تحقیقی اور علمی صلاحیتوں کا نقطۂ عروج ہے۔ اس میں انھوں نے ذوالقرنین کی شخصیت کا جس طرح تعین فرمایا ہے اور کہف کے محل و نوعیت کو جس طرح واضح کیا ہے اس میں ان کا مثیل کوئی دوسرا نہیں۔ انکے علاوہ اس سورت کی تفسیر میں کئی اور ایسے مقام بھی آتے ہیں جو مولانا آزاد کے اختصاصات قرار دیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً واقعۂ کہف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غار ثور میں قیام فرمانے اور پھر فتح و کامرانی حاصل کرنے کی طرف اشارہ پایا ہے۔ بحث کہ اصحاب کہف طویل مدت تک خوابیدہ رہنے کے بعد بیدار ہوئے یا ان پر موت

طاری ہوگئی تھی اور انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔ مولانا آزاد کی رائے ہے کہ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ میں "ایقاظ" سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا، نہ کہ بیداری اور خواب۔ چناں چہ عربی میں زندگی و موت کے لیے یہ تعبیر عام و معلوم ہے"۔ مولانا کی تحقیق ہے کہ "یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنھیں پیش آیا تھا وہ عیسائی تھے"۔ ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں مفسرین نے بڑی قیاس آرائیاں کی ہیں اور بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ سکندر ہے۔ مولانا آزاد نے نہایت حسن و خوبی سے ثابت کیا ہے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں ذوالقرنین فارس کا شہنشاہ سائرس ہے۔ بعد کے مفسرین میں سے بیشتر نے مولانا کی اسی تحقیق کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی پیروی کی ہے اس سورت میں یاجوج ماجوج کا بھی ذکر آیا ہے اور ان کے بارے میں مولانا کا قول فیصل ہے کہ وہ منگول قبائل ہیں۔

سولھویں سترہویں صدی کے آگرے کے ایک عارف و خطاط شاعر میر عبداللہ حسینی مشکیں قلم

از ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی احمد آباد

"یہ دلچسپ مقالہ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے آیوا یونیورسٹی (امریکا) کے ایک سمینار جس کا موضوع "ہندوستان کے اسلامی عہد کی عمارات کے کتبات" تھا، ۱۹۸۵ء میں پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی محکمۂ آثار قدیمہ میں کتبہ شناسی کے ڈائرکٹر تھے، انھوں نے ہندوستان کے اسلامی عہد کے صدہا کتبات کو روشناس کرانے میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا اس کی مثال ہندوستان میں نہیں ملے گی۔ انکے زیر نظر مقالے کا عنوان تھا "میر عبداللہ مشکیں قلم کے مقبرے کے کتبات" تھا۔ مقالہ انگریزی میں تھا جو ہنوز شایع نہیں ہوا ہے، امریکا کے اس سمینار میں راقم الحروف بھی شریک تھا اور ڈاکٹر ڈیسائی کے محققانہ مقالے سے کافی متاثر ہوا تھا۔ جی چاہا کہ اس مقالے سے اردو دنیا بھی مستفید ہو، اس بنا پر میری خواہش پر عزیزم ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے اس مقالے کو اردو میں منتقل کیا، راقم ان کا بیحد شکر گذار ہے، ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے مقالے نے میری دلچسپی اس حد تک بڑھائی کہ میں نے خود میر عبداللہ مشکیں قلم

اور ان کے دونوں بیٹوں: میر محمد صالح کشفی اور میر محمد مومن عرشی کی تصانیف کے بارے میں جتنی اطلاعات ممکن تھیں حاصل کیں اور حال ہی میں ایک مقالہ بعنوان میر محمد صالح کشفی اور ان کی کتاب: مناقب مرتضوی، مجلہ علوم اسلامیہ میں اشاعت کے لیے دیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے مقالے میں انھیں کی اجازت سے حاشیے میں کہیں کہیں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے اور مقالہ کے عنوان میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کر لی گئی۔

(پروفیسر نذیر احمد علی گڈھ)

ہندوستان میں عام طور پر خطاطوں اور مصوروں کے بارے میں لوگوں کا علم بہت محدود ہے حالانکہ تذکروں اور تاریخی کتابوں میں ان کے حالات درج ہیں، مثال کے طور پر اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سب سے اعلیٰ اور ماہر خطاط محمد حسین کشمیری زریں قلم سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ لوگوں کو نہ اس کی تاریخ وفات کا علم ہے اور نہ اس کے مدفن ہی کا۔ صرف خطاطوں اور مصوروں کی دستخط کردہ تحریریں، ان کے لکھے ہوئے مخطوطے اور وصلیاں وغیرہ ہماری رہنمائی کرتی اور ان کے بارے میں مختصر مگر تاریخ وار کوائف سے ہم کو روشناس کراتی ہیں لیکن انکی شخصیت کے دوسرے کوائف سے ہم بے خبر ہیں تاہم اپنے دور کے ماہر ترین اور مشہور ترین خطاط میر عبداللہ حسینی ترمذی مشکیں قلم اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ جہانگیر شاہی کا لاحقہ تحریر کرنے کے عادی ہیں۔

میر عبداللہ حسینی ترمذی کا قیام زیادہ تر الٰہ آباد اور آگرہ میں رہا۔ جہاں وہ صرف خطاط کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مرتبے کے صوفی کی حیثیت سے بھی معروف تھے ان کا تذکرہ ان کے مختلف معاصر تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصانیف میں کیا ہے،

ان کتابوں میں ان کے روحانی تصرف کا بھی ذکر ملتا ہے علاوہ ازیں ان کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کے بارے میں بھی ہم کو علم ہے۔ یہ تینوں اپنے زمانے کے ماہر خطاط، ادیب، شاعر اور صوفی تھے، ساتھ ہی ان کا شمار موسیقی کے ماہرین کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ میر عبداللہ حسینی ترمذی کی ایک نادر سوانح حیات "فاتح القلوب" جو غالباً ان کے بڑے بیٹے میر محمد صالح کی تحریر کردہ ہے، کامن ولیتھ لائبریری لندن میں محفوظ ہے، اس کا ایک اور نادر نسخہ ذخیرۂ مولانا آزاد، انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشن نئی دہلی میں بھی خوش قسمتی سے دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو ان کی تاریخ وفات اور مقام تدفین کا بھی علم ہے۔ بلکہ ان کے ایک معاصر مورخ نے تو مغلوں کے دارالحکومت آگرہ میں ان کے مکان کی بھی نشاندہی کردی ہے۔ گو ان کا مکان اب باقی نہیں ہے مگر ان کا مقبرہ اب بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ یہاں ایک اور مقبرہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جس کی تحقیق دریافت ماضی قریب میں ہوئی ہے۔ یہ مقبرہ ایک اور ماہر خطاط عبدالحق امانت خاں شیرازی کا ہے جو ضلع امرتسر کے ایک مقام سرائے امانت خاں میں واقع ہے، لیکن اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ امانت خاں نے سکندرہ میں اکبر کے مقبرہ کے بہت ہی خوبصورت نسخ اور نستعلیق کتبے لکھے ہیں، علاوہ بریں انھوں نے تاج محل، آگرہ کی شاہی مسجد اور خود اپنی بناکردہ سرائے، سرائے امانت خاں میں بھی اتنے ہی خوبصورت کتبے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سرائے امانت خاں چلے گئے جہاں وہ اپنی وفات تک قیام پذیر رہے۔

میر عبداللہ المتخلص بہ وصفی بن میر منظر حسین ترمذی، اکبر اور جہانگیر کے

دربار کے چار چوٹی کے ماہرین خطاط میں سے ایک تھے۔ وہ چودہویں۔ پندرہویں صدی کے مشہور و معروف ایرانی صوفی شاہ نعمت اللہ ولی کے اخلاف میں تھے۔ ان کے اجداد میں سید جہانگیر ہاشمی اور شاہ طیب ہروی بھی تھے جیسا کہ میر موصوف کے چھوٹے بیٹے میر مومن نے جن کا تخلص عرشی تھا۔ ایک نظم میں لکھا ہے۔ ان کا مادری رشتہ عہد اکبری کے بخشی خواجہ نظام الدین احمد سے تھا جو طبقات اکبری کے مصنف بھی ہیں تقریباً ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵-۹۶ء میں جب ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی مشہور تاریخ منتخب التواریخ لکھی وہ اکبر کے دربار میں احدی کے منصب پر فائز تھے۔ بقول بدایونی وہ خطاطی میں شاہ غیاث اور مولانا قمی کے شاگرد اور ہفت رقم تھے۔ ان کے دو بیٹے میر محمد صالح کشفیؔ اور میر محمد مومن عرشی محض خطاط ہی کی حیثیت سے مشہور نہ تھے بلکہ اس زمانے کے شاعروں دانشوروں اور صوفیوں کے زمرے میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ آخر الذکر کے پوتے، میر عبداللہ بن میر ہاشم حسینی بھی ادیب و شاعر تھے، ایک اور خطاط میر محمد شریف کے ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰-۳۱ء کے تحریر کردہ خطاطی کے ایک نمونے کا ہم کو علم ہے وہ بقول مرحوم ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مشکیں قلم کے بھانجے تھے لیکن ڈاکٹر چغتائی نے اس سلسلے میں اپنے ماخذ کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے جس کی مدد سے انکی بات کی تصدیق[1] یا تردید کی جاسکے۔

---

[1] مرأة العالم ج ۲ ص ۵۸۵ میں میر محمد شریف کا ذکر اس طرح آیا ہے "ہمشیرہ زادۂ میر عبداللہ خط نستعلیق را خوب می نوشت و از حضرت جنت آشیانی خطاب کاتب السلطانی یافتہ میر عبداللہ او را بجای فرزند تربیت نمودہ، وقت رحلتش جانشین خود ساختہ بود او باوجود کمالات گنامی پیشۂ خود کردہ در ملک فقر نام آوری داشت و وجہ قوت از کسب دست (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۲)

میر عبداللہ کی خطاطی کی شہرت نے ان کی ادبی اور روحانی حیثیت کو دھندلا کر دیا ہے۔ وہ فارسی کے شاعر تھے جن کا ذکر تذکرہ نگاروں نے بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان کی پانچ مثنویوں اور ایک دیوان کا ذکر بھی کیا ہے[1] مذکورہ مثنویوں میں سے صرف ایک کے بارے میں ہم کو علم ہے کہ وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کا دیوان ضایع ہو چکا ہے لیکن ان کے دیوان کے کچھ اشعار انکے معاصر بدایونی اور ان کے بعد کے تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں محفوظ ہیں علاوہ بر ایں بعض بعض بیاضوں میں بھی ان کے کلام کے جستہ جستہ نمونے مل جاتے ہیں۔ ان کی مثنوی گلشن اسرار جو ۱۰۰۵ھ میں نظم ہوئی تھی اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے (فہرست مخطوطات جلد اول ص ۱۲۰ نمبر ۱۸۴۷) چونکہ یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن اسرار کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی مثنویاں خمسۂ نظامی کے جواب میں نظم ہوئی ہوں گی[1]۔ مذکورہ دیوان اور مثنویوں کے علاوہ جہانگیر کی بیوی اور راجہ مان سنگھ کی بہن، شاہ بیگم کی قبر پہ جو اشعار کندہ ہیں وہ نہ صرف ان کی فکر کا نتیجہ ہیں بلکہ اس کی خطاطی بھی انہی کی ہے۔ اس کتبہ کے پس منظر میں بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور اشعار خوبصورت نستعلیق خط میں کندہ کیے گئے ہیں شاہ بیگم کی قبر آج بھی خسرو باغ الہ آباد میں موجود ہے اور یہ خوبصورت کتبہ

(حاشیہ ص ۲۷۱) پیدا کردہ وجہ معیشت خود می کرد۔ در سنہ یک ہزار و پنجاہ و چہار راقم احوال اعمالنامۂ عمرش بسر آورد ذیبی تاریخ عرشی نے بھی انکی وفات کے قطعہ میں لکھی ہے (نذیر احمد)

[1] مراۃ العالم جلد ۲ ص ۱۸۳ میں ہے کہ "پنج مثنوی و یک دیوان دارد"

آنے جانے والوں کے دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ (اپی گرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلی منٹ، ۱۹۶۱، پلیٹ ۲۱)[1]

باوجودیکہ میر عبداللہ کا تعلق دربار سے تھا اور وہ پیشہ ور خطاط تھے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے صوفیانہ انداز سے اپنی زندگی گذاری۔ وہ چشتیہ سلسلہ میں مرید تھے اور اس زمانے کے مشہور شیخ طریقت شیخ فیض اللہ سہارنپوری[2] سے ان کو نسبت بیعت حاصل تھی۔ ان کی حیات اور کرامات پر "فاتح القلوب" نام کی ایک کتاب ملتی ہے جس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ یہ ان کے کسی گمنام مرید کی ہے (فہرست مخطوطات فارسی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری آکسفورڈ ۱۹۰۳، ص ۳۱۶ نمبر ۶۵۰) لیکن غالباً یہ کتاب ان کے بیٹے کی تصنیف ہے جس کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے ہر طبقہ کے لوگ ان سے روحانی فیوض و برکات اور راہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے۔ صاحب "ذخیرۃ الخوانین" شیخ فرید بھکری اور ان کے والد دونوں ہی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ علاوہ بریں اکبر کے ایک قدیم خادم تاتار خاں سفرہ چی اور جہانگیر کے قلم تراش خواجہ ناصر دونوں ہی ان کے مریدوں میں تھے۔ شیخ فرید ان کو ایسے غوث العالم کے لقب سے یاد کرتے ہیں جن کے کشف و کرامات اور روحانی تصرف کو رقم کرنے سے قلم قاصر ہے۔ شیخ فرید اپنے پیر کی

---

[1] نیز دیکھئے W.E.Begley: Monumental Islamic Calligraphy from India. U.S.A. 1985 P.94 No.52

[2] خلیفہ شیخ نظام نارنولی، وفات ۱۰۲۵، مراۃ العالم ص ۴۸۳ (نذیر احمد)

سوانح میں ایک بہت دلچسپ داستان قلمبند کرتے ہیں۔ قاضی عماد جو کہ تورانی امرا کے خاندان سے تھے وہ اکبر کے عہد میں ٹیکس آفیسر اور آگرہ کے محلہ منگو بازار میں میرعبداللہ کے پڑوسی تھے۔ جب قاضی عماد کی مالی حالت بہتر ہوگئی تو انھوں نے اپنے مکان کو میرعبداللہ کے مکان سے زیادہ اونچا بنوا لیا۔ میرعبداللہ کو یہ بات پسند نہ آئی انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کی اطلاع شیخ فرید اور ان کے والد کے ذریعے قاضی عماد کو کی اور کہلایا کہ اپنے پڑوسیوں کا خیال نہ کرکے ان سے زیادہ اونچا مکان بنوانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاف کی مستورات کو بے پردہ دیکھنا ان جیسے شخص کو زیب نہیں دیتا۔ اس بات کو سن کر قاضی نے رعونت کا مظاہرہ کیا۔ میر عبداللہ جتنی زیادہ نرمی کا مظاہرہ کرتے جاتے قاضی کے رویے میں اتنی ہی سختی آتی جاتی۔ آخر کار میرعبداللہ نے شیخ فرید کے ذریعے قاضی کو یہ پیغام بھیجا کہ "ایک سال کے بعد نہ تو میں اس مکان میں رہوں گا اور نہ تم اس مکان میں" خوبیٔ قسمت کہ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ہی میرعبداللہ اور قاضی دونوں کا انتقال ہوگیا (ذخیرۃ الخوانین دوم ص ۴۰۰-۴۰۱) میرعبداللہ کے مرقد پر جو کتبہ نصب ہے اس میں ان کو قطب زماں، مظہر انوار جاوداں اور کان سخا کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے علاوہ بریں اس کتبہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ وہ چشتیہ صوفیہ میں باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

میرمحمد صالح کشفی

جیساکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے میرعبداللہ کے دونوں صاحبزادے بھی ماہر خطاط اور شاعر تھے اور تصوف کی طرف میلان بھی رکھتے تھے۔ بڑے صاحبزادے میرمحمد صالح کشفی نے اپنے انتقال کے وقت تک شاہجہاں کے کتابخانہ

میں داروغہ[1] کی حیثیت سے کام کیا وہ نہ صدی ذات صد سوار کے منصب دار تھے ان کی ادبی یادگاروں میں ان کا وہ ترجیع بند شامل ہے جس کا عنوان "مجموعۂ راز" ہے۔ یہ ترجیع بند متعدد بار شایع ہو چکا ہے ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر شیخ چاند حسین نے اس کا متن مع مقدمہ بزبان انگریزی جرنل آف دی بومبے برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نئی سیریز شمارہ ۱۸ صفحات ۶۸-۱۳۰ پر شایع کیا ہے انکی ایک اور کتاب مناقب مرتضوی بھی مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہے اور تاریخ آگرہ کے مصنف سعید احمد مارہروی کے قول کے مطابق مناقب مرتضوی کا ایک دیدہ زیب[2] مخطوطہ میر ضامن علی رضوی ٹرسٹ آگرہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے اور بقول سراج الدین علی خاں آرزو، کشفی نے مثنوی مولانا روم کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا تھا اور اسی کی پیروی میں مناقب مرتضوی[3] مرتب کی کشفی کا ارادہ تھا کہ وہ اعجاز مصطفوی کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ بھی تحریر کریں لیکن اس کتاب

---

[1] بظاہر کشفی جلوس سال ۲۳، ربیع الاول ۱۰۶۰ھ میں داروغہ کتابخانہ ہوئے تھے (عمل صالح ۳:۴۴) اور چوبیسویں سال جلوس ۵ شعبان ۱۰۶۰ میں انتقال کیا، اسطرح وہ چند ماہ سے زیادہ داروغہ کتابخانہ نہ تھے (عمل صالح ۳: ۸۷) عبارت یہ ہے "چہاردہم شعبان سال ہزار و شصت مظہر فیض جلی میر سید علی ولد سید جلال مرحوم بخدمت داروغگی کتابخانہ و نقاش خانہ از انتقال میر صالح خوشنویس کہ پنجم ماہ مذکور سر بر خط اجل نہادہ نقش حیاتش از صفحہ روزگار محو شدہ بود" اس بنا پر ۱۰۶۱ھ جو انکی تاریخ وفات بتائی جاتی ہے درست نہ ہوگی (نذیر احمد) [2] راقم نے وہاں دو نسخے دیکھے، ایک ۱۲۴۴ کا مکتوبہ اور دوسرا ۱۲۶۳ کا، دونوں اس صفت سے خالی ہیں جس کا ذکر مارہروی صاحب نے کیا ہے (نذیر احمد) [3] یہ مناقب مرتضوی نثر میں ہے البتہ اس میں مثنوی کے صدہا شعر مختلف مواقع پر درج ہیں (نذیر احمد)۔

کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بھائی کے پوتے میر عبداللہ واصفی نے مذکورہ کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا بقول سعید احمد مارہروی انھوں نے فن موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا جس کا ایک نسخہ کتبخانہ محمدیہ آگرہ میں اس زمانے میں موجود تھا۔ انھوں[1] نے فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں کشفی اور سبحان تخلص کے ساتھ شعر کہے ہیں انکے مجموعۂ کلام کے کسی کتابخانہ میں محفوظ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ اسپرنگر نے لکھا ہے کہ ان کے قصیدوں کا مجموعہ "قصاید کشفی" موتی محل لائبریری لکھنؤ میں محفوظ تھا لیکن اب اس کا کہیں پتہ نہیں۔ انکے اشعار تذکروں اور دو غزلیں ایک وصلی میں ضرور ملتی ہیں۔ تین تاریخی مادوں میں ان کے مزید دس اشعار ملتے ہیں جو آگرہ میں انکے والد کے مزار پر خود ان کے کندہ کیے ہوئے ہیں۔ تھامس ولیم بیل نے مفتاح التواریخ میں انکا وہ منظوم مادۂ تاریخ نقل کیا ہے جو انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے موقع پر لکھا تھا۔ ان کی خطاطی کے نمونے کمیاب ہیں بقول ڈاکٹر مہدی بیانی ایک وصلی میں انھوں نے خود اپنی ایک رباعی تحریر کی ہے جو تہران کے کتابخانۂ ملی میں محفوظ ہے علاوہ بریں باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی ان کی تحریر کردہ تین وصلیاں ایک البم میں موجود ہیں۔ برٹش میوزیم کے کتابخانے میں ایک البم میں ایک تحریر محفوظ ہے جس پر محمد صالح الحسینی کے دستخط ہیں گمان غالب یہ ہے کہ یہ تحریر بھی انھی کی ہوگی۔ اسی طرح سالار جنگ میوزیم میں بھی ایک تحریر ہے جس پر میر صالح کے دستخط اور سنہ درج ہے ممکن ہے یہ بھی انھی کی تحریر ہو۔ سالار جنگ میوزیم

[1] ان کی مثنوی کے کافی اشعار چند غزلیں اور ایک دو قصیدے "مناقب مرتضوی" میں نقل ہیں۔ (نذیر احمد)

میں خوبصورت نستعلیق خط کی ۵ وصلیاں اور بھی ہیں جن میں میر عبداللہ کے روحانی تجربات بھی مندرج ہیں، اس تحریر کا خاتمہ اس فقرے پر ہوتا ہے "مرید میر عبداللہ صالح" یعنی میر عبداللہ کے مرید صالح۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کے خطاط صالح ہیں اور یہ میر عبداللہ کے صاحبزادے کے علاوہ کوئی اور شخص نہیں ہوسکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس یادداشت کا متن اس "فتوح القلوب" کا کوئی ٹکڑا ہو جس کو ڈاکٹر ایتھے نے ان کے کسی گمنام مرید کی تصنیف بتایا ہے، اگر یہ درست ہے تو ان کی سوانح کے مصنف ان کے صاحبزادے ہیں جو اپنے آپ کو ان کا مرید قرار دیتے ہیں۔ ایک وصلی کا اور بھی ذکر ملتا ہے جس میں انھوں نے خود اپنی دو غزلیں تحریر کی ہیں۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں "بادشاہ نامہ" کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے کاتب کا نام ایوانوف نے میر محمد صالح الکاتب لکھا ہے ممکن ہے یہ میر محمد صالح ہی ہوں جن کا تخلص کشفی ہے (اسٹوری ص ۵۷۵)

میر محمد مومن عرشی | میر عبداللہ کے دوسرے صاحبزادے، میر محمد مومن، دارا شکوہ کے لڑکے سلیمان شکوہ کے اتالیق تھے۔ صاحب مجمع النفائس، سراج الدین علی خاں آرزو کے قول کے مطابق وہ دارا شکوہ کے مداح تھے اور اس کی مدح میں قصاید لکھے۔ دارا شکوہ کی یہی مداحی (بقول بعض تذکرہ نگار) اس کی ناکامی کے بعد عرشی کی عملی زندگی سے دست برداری کا موجب ہوئی۔ ان کے ادبی آثار خاصے قابل توجہ ہیں۔ ان کا ایک دیوان جس کی کتابت ان کی زندگی ہی میں ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲-۶۳ء میں ہوئی تھی سالار جنگ میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس دیوان میں غزلیات...

قصاید، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعیات اور قطعات سب ہی اصناف سخن کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی میوزیم میں ان کے دیوان کا ایک انتخاب بھی محفوظ ہے۔ ان کا ایک ترجیع بند بھی ملتا ہے جو نہایت عمدہ نستعلیق خط میں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ان کے کلیات کا ایک نسخہ محفوظ ہے جس میں ایک ساقی نامہ اور دو مثنویاں شاہد عرشی اور نسخہ مہر و وفا محفوظ ہیں۔ کلیات کی کتابت ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد یعنی ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱-۸۲ء) میں ہوئی تھی۔ اے۔ اسپرنگر نے اپنی مرتب کردہ فہرست مخطوطات میں اول الذکر کا ایک دیدہ زیب نسخہ موتی محل لائبریری میں اور اسی کے ایک اور دیدہ زیب نسخے کی ایک ذاتی ذخیرے میں موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی مہر و وفا کا انتساب شاہ جہاں کے نام ہے، اس سے صاحب مثنوی کے اسلاف کے بارے میں جو خود شاعر تھے اطلاعات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مثنوی کا مقدمہ خود عرشی کا تحریر کیا ہوا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں انکے دیوان کا ایک مختصر سا انتخاب بھی محفوظ ہے جسمیں انکی صرف غزلیات ملتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ان کے دیوان کا ایک نسخہ ہے۔ ان کے متعدد اشعار تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکروں میں بھی محفوظ کر دیئے ہیں۔ بقول سراج الدین علی خاں آرزو، ان کا دیوان یوں تو بہت سہل ہے مگر اسکے مقاصد بلند اور خیالات اعلیٰ درجے کے ہیں۔

عرشی کی خطاطی کے نمونے انتہائی کمیاب ہیں ایک وصلی جس کو انھوں نے ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۲-۵۳ء) میں تحریر کیا تھا ببلیو تھیکا نیشنالی پیرس میں بتائی جاتی ہے۔ ایک دوسری وصلی برٹش میوزیم لندن میں ہے جس پر ۱۰۹۲ھ درج ہے۔

دیوان حسن کا ایک بہت خوبصورت نسخہ جس کی کتابت محمد حسین کشمیری نے ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱-۱۶۰۲ء) میں کی تھی، ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲-۶۳ء) میں غضنفر خاں کے کتابخانے میں میر محمد مومن خوش نویس کے ذریعے داخل کیا گیا تھا۔ یہ میر محمد مومن خوش نویس، عرشی ہی ہیں جن کا تذکرہ ہم ان سطور میں کر رہے ہیں۔ دیوان حسن کا یہ نسخہ اب خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

شاہزادے کے اتالیق ہونے کی وجہ سے اگرچہ عرشی کو دنیاوی وجاہت حاصل تھی مگر دنیا کی طرف ان کا میلان طبع نہ تھا، عزلت اور فقر کی زندگی بسر کرتے۔ ممکن ہے اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کا سبب دارا شکوہ سے ان کا تعلق رہا ہو۔ نوے برس کی عمر میں ۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰-۸۱ء) میں انھوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے میر ہاشم نعمت اللہ الحسینی کے صاحبزادے اور عرشی کے پوتے میر عبداللہ نے جب وہ خراسان میں تھے ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴-۴۵ء) میں کشفی کی "اعجاز مصطفوی" کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس کا ایک نادر مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ جب سراج الدین علی خاں آرزو نے تقریباً ۱۱۶۴ھ میں اپنی کتاب تحریر کی اس وقت تک میر عبداللہ کے اخلاف آگرہ میں موجود تھے۔

میر عبداللہ کے ایک معاصر مصور کے ہاتھ کا ان کا ایک عکس بھی ملتا ہے۔ میر عبداللہ کا شمار اکبر اور جہانگیر کے دور کے ان چار خطاطوں میں ہوتا ہے جن کے عکس ان کے کتابت کردہ مخطوطے میں بنوائے گئے تھے۔ دیوان حسن سجزی کا وہ نسخہ جو والٹر آرٹ گیلری، بالٹی مور، امریکا میں محفوظ ہے میر عبداللہ

کا کتابت کردہ ہے اور اس کا سنہ کتابت ۱۶۰۲-۱۶۰۳ء ہے۔ اس مخطوطے
میں ان کا جو عکس ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اپنی عمر کے
چوتھے دہے کے آخری یا پانچویں دہے کے ابتدائی حصے میں تھے۔ اس سے انکی
تاریخ ولادت کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے جو ۹۶۰ھ/۱۵۵۲-۱۵۵۳ء کے لگ بھگ
ہوگی۔[1]

میر عبداللہ کی خطاطی کے نمونے کمیاب نہیں ہیں جو بہترین خط نستعلیق میں ہیں
ان کے جن نمونوں کا اب تک علم ہو سکا ہے اس کی فہرست درج ذیل ہے!

۱۔ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ خط نستعلیق میں لکھا ہوا دس پینل جس کی تاریخ تحریر ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵-۹۶ء ہے۔ اس پینل پر ان کے پورے دستخط موجود ہیں جس کو انھوں نے اس طرح تحریر کیا ہے "عبداللہ مشکیں قلم الحسینی الترمذی"۔

۲۔ ایک قطعہ جس کا سنہ کتابت ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲-۱۶۰۳ء ہے۔ یہ بھی سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے

۳۔ دیوان حسن سجزی، مکتوبہ ۱۰۱۱ھ، اس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں کیا جاچکا ہے

۴۔ برٹش میوزیم لندن میں ۱۰۱۱ھ کی کتابت کردہ ایک وصلی۔

۵۔ آقای اکریم زادہ، تہران کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی مکتوبہ ۱۰۱۱ھ،

۶۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ پند نامۂ جہانگیری،

۷۔ ڈاکٹر مہدی بیانی، تہران کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی مکتوبہ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳-۱۶۱۴ء،

[1] مثنوی میں انکی عمر ۳۵ سال کی تھی، اسوقت انکے چھوٹے بیٹے محمد مومن ۴ سال کے تھے، محمد مومن کی پیدائش ۱۰۰۱ھ میں ہوئی تھی اس حساب سے یہ مثنوی ۱۰۰۵ھ کی ہے اور اسی کی رو سے ان کی تاریخ پیدائش (۱۰۰۵-۳۵) = ۹۷۰ھ قرار پاتی ہے (نذیر احمد)

۸۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ایک وصلی جس میں خود انہی کی ایک رباعی درج ہے

۹۔ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ بغیر تاریخ کی ایک وصلی جس میں انکے تین اشعار ہیں۔

۱۰۔ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ایک اور بے تاریخ وصلی اس پہ صرف عبداللہ الحسینی بطور دستخط تحریر ہے۔

۱۱۔ آقا جعفر سلطان القرائی کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی جس میں ساتوں خط کے نمونے ہیں۔

۱۲۔ بوسٹن کے میوزیم آف فائن آرٹس میں محفوظ ذخیرۂ راس کمار سوامی کی ایک وصلی۔

خطاطی کے مذکورہ نمونوں کے علاوہ چند نمونے ایسے بھی ملتے ہیں جن پر عبداللہ
مشکیں قلم یا میر عبداللہ مشکیں قلم کے دستخط ہیں کبھی کبھی الحسینی اور الترمذی کی
نسبت کا اضافہ بھی ملتا ہے گمان غالب یہی ہے کہ یہ انہیں کی تحریریں ہوں گی۔

میر عبداللہ ان چار مخصوص خطاطوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریر کے نمونے
پتھروں پر ثبت ہیں۔ پتھر پر ان کی بہترین خطاطی کا ایک اعلیٰ نمونہ جو ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳-۱۶۰۴ء
کا تحریر کردہ ہے جہانگیر کی رفیقۂ حیات شاہ بیگم کی قبر پر کندہ ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا
جاچکا ہے یہ قبر الہ آباد کے خسرو باغ میں آج بھی موجود ہے۔

قلعۂ الہ آباد کے مشہور و معروف ستون کا ایک کتبہ بھی انہی کا لکھا ہوا ہے جو
جہانگیر کے پہلے سال جلوس کے موقع پر تعمیر ہوا تھا۔ یہ کتبہ دیدہ زیب نستعلیق میں
ہے اور اس میں جہانگیر کا نسب نامہ تیمور تک کندہ ہے۔ سنگ موسیٰ کے ایک
تخت کا کتبہ جو الہ آباد میں تیار ہوا تھا اور اب آگرے میں ہے، یہ اس وقت کی

یادگار ہے جب جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور اس کی تاج پوشی بھی عمل میں آچکی تھی، یقین ہے کہ انہی کا ہوگا۔ یہ کتبہ بعینہٖ ویسا ہی ہے جیسا شاہ بیگم کے مزار کا کتبہ۔ میرا ذاتی رجحان اس طرف ہے کہ حوض جہانگیری کے ۱۰۱۹ھ کا کتبہ بھی انہی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کتبہ میں بھی وہی خط نستعلیق اور اسی طرح کے بیل بوٹے ہیں جس طرح شاہ بیگم کے مزار اور تخت شاہی کے کتبوں میں ہیں۔ جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵-۱۶۱۶ء) کے سفر اجمیر کی یادگار میں جو عمارت اجمیر کے نزدیک چشمۂ نور کے مقام پر بنوائی تھی اس کے دیدہ زیب اور دلکش کتبے پر کاتب کا نام عبداللہ کندہ ہے لیکن اس نام کے ساتھ کوئی نسبت درج نہیں ہے اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ کتبہ میر عبداللہ مشکیں قلم کا تحریر کردہ ہے۔ تاہم میرا رجحان یہی ہے کیونکہ غالب گمان یہی ہے کہ اس کتبہ کو جہانگیر نے اپنے مقرب خطاط سے لکھوایا ہوگا لیکن اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی نسبت کیوں نہیں لکھی حالانکہ اس پتھر پر لکھنے کے لیے خاصی جگہ موجود تھی۔

۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵-۱۶۲۶ء) میں مشکیں قلم کا انتقال ہوا۔ برٹش میوزیم لندن کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر ریو اور ان کی تقلید میں مہدی بیانی نے ان کا سال وفات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۵-۱۶۱۶ء) تحریر کیا ہے جو بلاشبہ غلط ہے[1]۔ ان کے لوح مزار کے کتبہ میں دو مادۂ تاریخ درج ہیں جو آگے نقل کیے جائیں گے۔ ان سے ۱۰۳۵ھ برآمد ہوتا ہے نہ کہ ۱۰۲۵ھ۔

مشکیں قلم کو چاہے منفرد خطاط نہ کہا جائے لیکن وہ ان معدودے چند

---

[1] مرأة العالم ج ۲ ص ۳۸۳ میں بھی تاریخ وفات ۱۰۲۵ھ ہی ہے۔ (نذیر احمد)

خطاطوں میں ضرور تھے جن کی آخری آرام گاہ کو نہ امتداد زمانہ محو کر سکا ہے اور نہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی ہی اس پر کوئی تصرف کر سکی ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان کی شہرت صرف ایک خطاط کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ وہ عوام میں ایک صوفی و عارف کی حیثیت سے زیادہ مقبول تھے۔ چنانچہ لوگ جس طرح انکی زندگی میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو سعادت سمجھتے تھے اسی طرح انکے انتقال کے بعد بھی انکے مرقد پر حاضری دینے کو سعادت جانتے ہوں۔ آگرہ میں انکا مزار "درگاہ ستارۂ ہند" کے نام سے موسوم ہے جسکی لوگ آج بھی زیارت کرتے ہیں۔

آگرہ کے قندھاری بازار کے نزدیک "نگلا جواہر" نام کی جو بستی ہے اسی میں ان کا مقبرہ ایک وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ اس بستی کو شہر آگرہ کے سروے آف انڈیا کے نقشے میں جواہر نگر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ جگہ تلسی سنیما ہال کے کچھ مغرب میں سکندرہ۔ جمنا بائی پاس پر واقع ہے۔ مذکورہ احاطہ میں بہت سی قبریں ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ کچھ ہی عرصہ قبل یہ جگہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھی۔ بقول شیخ فرید، میر عبداللہ اس بستی میں جو شاہجہاں کے زمانے میں منگو باغ کے نام سے موسوم تھی وزیر خاں کی حویلی کے قریب بود و باش رکھتے تھے۔ کیا ان کا مدفن انکے مسکن میں ہی ہے؟ صوفیہ اور عارفین اکثر و بیشتر انسی جگہ پر مدفون ہیں جہاں وہ زندگی میں قیام کرتے یا نمازیں پڑھتے۔ کیا مشکیں قلم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا؟

نسبتاً کم طویل و عریض اور سادہ انداز کے مقبروں کے برعکس یہ مقبرہ اس زمانے کے طرز تعمیر کے مطابق مربع نما ہے وہ خوبصورت کتبے جن میں میر

عبداللہ کی تاریخ وفات اور تاریخ مقبرہ کندہ ہیں خوبصورت نستعلیق خط میں ہیں یہ کتبے چھت سے ملی ہوئی اندرونی دیوار کے افقی محراب پر چاروں طرف کندہ ہیں کتبہ کے اشعار کچھ زیادہ اچھے نہیں مگر خط ماہرانہ انداز کا ہے کتبہ کے اشعار میر عبداللہ کے بڑے صاحبزادے میر محمد صالح کشفی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہیں اور انہی کے ماہرانہ ہاتھوں نے پتھر پر ان کو کندہ بھی کیا ہے۔ اس کتبہ میں میر عبداللہ کو قطب زماں قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کو چشتیہ صوفیہ میں ذی مرتبہ اور بلند و بالا درجہ کا حامل قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی تحریر ہے کہ ان کو تمام علوم میں ماہرانہ دسترس تھی اور ان کے مزار سے کوئی بھی شخص نامراد واپس نہیں جاتا۔ مقبرہ کے مغربی پہلو سے متصل جو مسجد ہے وہ نسبتاً بڑی ہے۔ مسجد میں ایک بڑا مسقف ہال ہے جس کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اس مسجد کا طرز تعمیر مقبرہ ہی جیسا ہے۔

مذکورہ کتبہ میں تین قطعات ہیں۔ دو قطعات شرح حال سے متعلق ہیں اور تیسرے میں تعمیر مقبرہ کی تاریخ ہے کتبوں کا انداز سادہ ہے مگر خط انتہائی خوبصورت نستعلیق ہے۔ حروف کا رنگ روغنی ہے اسی لیے کاغذ پر اس کا عکس اچھا نہیں آ سکا اسکے باوجود ان سے کشفی کی ماہرانہ ہنرمندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شمالی دیوار کے مشرقی سرے کے آخر سے یہ کتبے شروع ہوتے ہیں، کتبوں کے اشعار یوں ہیں:

نیم غمگین ازین معنی کہ میرم　　ازین دار فنا سوی جنان رفت

بحمد اللہ کہ عرفان کرد حاصل　　نہ بیداری زگیتی رائیگان رفت

چو تاریخ وفاتش جستم از دل　　ازین ماتم فغان بر آسمان رفت
دلم گفتہ بصد درد و بصد آہ　　ز دنیای دنی قطب زمان رفت

تاریخ دوم

شیخ زمانہ مظہر انوار جاودان　　کز خواجگان چشت بگیتی نشانہ بود

دریای جود و کان صفا قطب وقت میر　　عبداللہ آنکہ در ہمہ فن ہا یگانہ بود

کشفی سوال کرد ز تاریخ رحلتش　　ہم خود جواب داد کہ شیخ زمانہ بود

تاریخ روضہ

کشفیا سر بر این جناب بنہ　　کہ ازین باب کس نہ شد نومید

گرد این روضہ روز و شب گردان　　چرخ با انجم و مہ و خورشید

سال اتمام این مکان شریف　　ہاتفی گفت روضۂ جاوید

لراقمہ محمد صالح الحسینی

مفتاح التواریخ اور اورینٹل ببلیوگرافیکل ڈکشنری کے مولف تھامس ولیم بیل نے ان کتبوں کا چربہ ہنری بلاخ مان کو عنایت کیا تھا اور انھوں نے ان کتبوں کو پہلی بار ایشیاٹک سوسائٹی کی ۱۸۷۰ کی روئداد میں شایع کیا۔ مولوی سعید احمد مارہروی کی اردو کتاب بستان اخیار یا تذکرہ مشاہیر اکبرآباد (۱۳۳۱ھ) میں بھی یہ کتبے شایع ہوئے ہیں۔ دونوں ہی حضرات سے ان کتبوں کے پڑھنے میں کچھ تسامح ہوا ہے ایک غلطی تو یہی ہے کہ بلاخ مان نے متن میں سے شاعر اور خطاط کا نام خارج کر دیا ہے۔ مولوی سعید احمد مارہروی نے محمد صالح حسینی کو محمد صالح چشتی پڑھا ہے اسکے علاوہ لراقمہ کا ل چھوڑ گئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اوپر درج اشعار بھی اسی شاعر کے ہیں۔

یہ بات عام طور سے کہی جاتی ہے کہ میر عبداللہ کو مشکیں قلم کا خطاب جہانگیر سے ملا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ صرف شاہزادہ سلیم تھا اور اکبر سے باغی ہو کر تقریباً ۱۶۰۲ء میں اس نے اپنا دربار الہ آباد میں شروع کر دیا تھا لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵-۹۶ء) کی میر عبداللہ کی ایک تحریر ہمارے سامنے ہے جس میں انھوں نے اپنا پورا دستخط اسی خطاب کے ساتھ کیا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو جہانگیر نے اکبر سے بغاوت کی تھی۔ اور نہ اپنا آزادانہ دربار الہ آباد میں منعقد کرنا شروع کیا تھا۔

اردو کی ایک قدیم مثنوی

"احوال قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

(۳)

اس سے پہلے ہم نے قادر ولی کی زندگی کے بعض پوشیدہ اور اہم گوشوں کو نمایاں کرنے کی غرض سے صرف مذکورہ مثنوی کے مواد سے بحث کی ہے اس کی ادبی، لسانی یا کسی اور خصوصیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی مگر جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کسی مثنوی سے بحث کرتے وقت جب تک ہم اس کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر نہیں کرتے بات پوری نہیں ہوتی، اسی لیے ہم یہاں اس مثنوی کی بعض فنی، ادبی، لسانی اور سماجی خصوصیات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالے دیتے ہیں تاکہ مثنوی کے یہ پہلو بھی واضح ہو جائیں اور بات بھی ادھوری نہ رہے۔

فنی پہلو: مثنوی کی متعدد بحریں ہیں، لیکن ایک شاعر جب اپنی مثنوی کے لیے کوئی خاص بحر چن لیتا ہے تو آخر وقت تک اسی پر قائم رہتا ہے، بہت کم کوئی تبدیلی کرتا ہے، اس مثنوی میں شاعر نے تھوڑی سی جدت برتی ہے

اور اپنی مثنوی کے لیے ایک کی بجائے دو بحریں چنی ہیں ایک سرخیوں کے لیے اور دوسری اصل مضمون کے لیے زیادہ تر سرخیاں منظوم ہیں اور دو دو اشعار پر مشتمل ہیں، وزن ہے فعولن فعولن فعولن فعل۔

دعائیہ مضمون کی سرخی: ذرا ساقیا سن میری التجا　　　مجھے میرے مطلب کی دارو پلا
دعا مانگتا ہوں میں ہو مستقیم　　　کہ ہے ذات تیری رحیم و کریم.

نعتیہ مضمون کی سرخی: شراباً طہورا پلا ساقیا　　　کہ لکھتا ہوں نعت رسول خدا
وہ لاریب سلطان لولاک ہے　　　چراغ زمیں شمع افلاک ہے

ذکر معراج کی سرخی: ارے ساقی وقت کرم آج ہے　　　کہ دل مائلِ ذکرِ معراج ہے
میری فکر عالی طفیل رسول　　　ہے مشغولِ سیر عروج و نزول

اس طرح یہ سلسلہ مثنوی کے اختتام تک جاری رہتا ہے اور ایک دوسرے سے مربوط بھی، وہ اس طرح کہ اگر ان ساری سرخیوں کو ترتیب وار یکجا کر دیا جائے تو اصل مثنوی کا پورا مضمون مختصراً اس میں آجاتا ہے، یہ سارے اشعار سرخ روشنائی میں لکھے ہیں:

اس کے برعکس اصل مضمون کے اشعار کا وزن ہے، مفاعیلن مفاعیلن فعولن، چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہے لائق حمد کے وہ قادر حق　　　فلک کو جو کیا بر پا معلق
عجب کچھ اسکی قدرت ہے کہ یکسر　　　زمیں پانی پہ پانی ہے زمیں پر
نکالا سنگ کے سینے سے جوہر　　　شکم سے ابر کے برسایا گوہر
کیا روشن بدن میں جان کا شمع　　　نین میں نور بینائی کیا جمع

سماعت کے لیے ہے گوش بخشا   سخن فہمی کی خاطر ہوش بخشا

وہی رزّاق عالم ہر کہیں ہے   اسی کا نام رب العالمین ہے

مثنویوں میں حالات و واقعات بیان کرتے وقت، موقع محل کی مناسبت سے قطعات یا غزلوں کا استعمال ایک عام بات ہے، اس مثنوی میں قطعات تو نہیں البتہ دو غزلیں ہیں اور دونوں قادر ولی کی شان میں ہیں، ایک میں شاعر نے انھیں قادر ولی کے نام سے اور دوسری میں شاہ میراں کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قادر ولی کے علاوہ شاہ میراں کے نام سے بھی مشہور تھے تنجور گزیٹیر (Tanjore Gazetteer 1906) کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، لکھا ہے "ناگور، مدراس پریسیڈنسی (Presidency) اور اس کے باہر خاص طور پر ایک مسلمان ولی میراں صاحب کی درگاہ کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ وہ چار سو سال پہلے زندہ تھے اور ان کی درگاہ کو تنجور کے راجاؤں کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے مینار بھی انہی راجاؤں کے بنائے ہوئے ہیں، اس ولی کے متعلق کئی عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں، ان کا عرس ہر سال موسم خزاں میں ہوتا ہے، پریسیڈنسی کے مختلف حصوں سے اور پریسیڈنسی کے باہر سے ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ وہاں کھنچ کر چلے آتے ہیں جنھوں نے کوئی نہ کوئی منت مان رکھی تھی، ہندو (یہاں تک کہ برہمن بھی) ان کی درگاہ پر نذر چڑھانے کے لیے آتے ہیں، یہ عرس عام طور پر بارہ دن جاری رہتا ہے اور اس کی زیادہ تر رسوم رات میں ادا کی جاتی ہیں"۔

ان دو غزلوں کے مطلع اور مقطع اس طرح ہیں:

(۱) یقیں تھا قطب عالم شاہ قادر   عجب تھی ذات حق آگاہ قادر

لکھے کیا وصف اس اس عالی نامی   ہے رشک آسمان درگاہ قادر

(۲) نواسا مصطفیٰ کا شاہ میراں   ہے پوتا مرتضیٰ کا شاہ میراں

غرض نامی سے کب ہو انکی تعریف   مقرب ہے خدا کا شاہ میراں

ادبی پہلو: اردو میں مثنویاں ایک دو نہیں ہزاروں لکھی گئی ہیں، مگر ہمارے تنقید نگاروں نے صرف دو تین ہی کو قابل اعتنا سمجھا اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے حالانکہ ہر مثنوی کا اس کا اپنا ایک حسن ہے، ایک خوبی ہے، ایک معیار ہے جو دوسری مثنویوں کے حسن و خوبی اور معیار سے الگ' بالکل الگ ہوتا ہے، زیر بحث مثنوی گو اردو کے معروف مرکزوں سے دور بیٹھ کر لکھی گئی ہے مگر اس میں بھی مواد اور ہیئت کے اعتبار سے وہ ساری ادبی خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی مثنوی میں ہونی چاہئیں، صاف ستھری، رواں دواں، تازگی اور توانائی سے معمور ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی طرح۔ یہاں اس کی ہر خوبی کی تعریف کرنا ممکن نہیں، شاعر کا بیان کیا ہوا صرف ایک نئی نویلی دلھن کا سراپا یہاں پیش کیا جاتا ہے، دیکھیے ادبی نقطۂ نظر سے آپ کو کیسا لگتا ہے:

ذرا مشاطہ جو منھ کھول دیکھی   عجب گوہر دھرا انمول دیکھی

رخ اس کا تھا گل باغ جوانی   بہار بوستان زندگانی

مصفا رخ پر اسکے آب اور تاب   ہو جیسا آئینہ میں عکس مہتاب

اگر درپن کو وہ ٹک منھ دکھائے   پری شیشے کے اندر منھ چھپائے

عجب تھا خوش نما دو چشم و ابرو — بعینہ آہو اور دو شاخ آہو

وہ ترک چشم کیونکر ہوں نہ سرکش — کمان ابرو سے ہے مژگاں سے ترکش

ذرا چمکے جو وہ صبح بنا گوش — چراغ مہر کو کہ دیوے خاموش

وہ لانبی چوٹی سی چوٹی کہاں تھی — سواد اعظم ہندوستاں تھی

دہن وہ آب حیواں کا صدف تھا — کہ دنداں سے سدا گوہر بہ کف تھا

کہاں اس لب سا تھا یاقوت رخشاں — خجل جس سے تھا نت لعل بدخشاں

تھی جیسی وہ صراحی دار گردن — ہو کب مینا کی ووں ہموار گردن

اگر دیکھے ذرہ وہ قد و قامت — یقول الخلق قد قامت قیامت

اگر نازِ خرام اپنا بتاوے — تو ہنس اپنی ہنسی کو بھول جاوے

شکم خوش رنگ جیسے خرمن گل — تھی ناف اس میں بہ رنگ چشم بلبل

سراسر مو سے نازک تر میاں ہے — نہیں کچھ جز نزاکت درمیاں ہے

جو دیکھیں ساق سیمیں کی لطافت — تو ہووے شمع کافوری کو حسرت

غرض مشاطہ عاروس کو سنواری — اور اپنے دل سے اسے اسپند واری

لسانی پہلو: مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ متعدد زبانوں کا عالم بھی ہے، وہ اپنے اشعار میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتا ہے اور بعض اوقات جملے کے جملے اس روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے اشعار میں برتتے ہیں کہ نفس مضمون کی تاثیر دوبالا ہوگئی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عربی: بشیرے تا ملک گلبانگ تھا یہ — کہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ

لگے کہنے کو ہر یک ہو کے غمگیں — اغثنی یا غیاث المستغیثین

سمجھ اللہ کو بے مثل و یکا — فلا تجعل مع اللہ الٰھا

اسی دم غیب سے فی الفور اس جا — صدا آئی کہ انت القطب حقا

اگر دیکھے ذرا وہ قد و قامت — یقول الخلق قد قامت قیامت

نہیں اب آرزو دنیائے دوں کی — ہے لو انا الیہ راجعوں کی

فارسی: کہا حضرت نے تب رزاق خدا ہے — نہ ہوؤ گھابرے تم سب بھلا ہے

بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد — اگر خاری بود گلدستہ گردد

چمن رنگیں ہو رنگ ارغواں سے — ثنا کرتا تھا سوسن کئی زباں سے

چوں دیدہ آں گل باغ صفا را — گلستاں گفت منت مرخدا را

بڑا مردود یہ مشرک ہے واللہ — کیا ہے داؤ سے بہتوں کو گمراہ

اگر ابلیس بر روی زمین است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہندی: وہ ندی چوڑی اور گہری بڑی تھی — میان راہ دریا سے اڑی تھی

تھا گویا تر بدا ایک اس کا نالا — وہ تھی گنگا کی ماں جمنا کی خالا

کیے سیر اگیاں جو شہ کا درشن — گئے ہیں بھول اپنا رام لچھمن

وہیں ڈنڈوت کر کے سر جھکائے — ادب سے آگے اس سرور کے آئے

عنایت سے مجھے بخشو مرا داج — دیا فرماؤ مجھ پر تم اے مہراج

پران اپنا کروں میں تم پہ قربان — دھنی کا میرے اب کر دیجیے جی دان

سیاسی پہلو: تادر ولی نے ہندوستانی تاریخ کے جس دور میں جنم لیا وہ بڑا ہی پر آشوب دور تھا، مغلوں کی طاقت روبہ زوال تھی، ہر طرف مرہٹے سر

اٹھا رہے تھے، سکھوں نے الگ اپنا علم بغاوت بلند کر رکھا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی ممالک کے لوگ تجارت کے نام پر ہندوستان میں اپنی سازشوں کا جال پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، ہر طرف بے کسی اور بے بسی کا ایک عجیب عالم تھا، نہ تخت نشین یہ جانتے تھے کہ کب ان کا تخت ان سے چھن جائے گا نہ فرش نشینوں کو یہ معلوم تھا کہ کب ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی اسب نفسا نفسی کے عالم میں مبتلا تھے، ظاہر ہے کہ اس بحرانی دور کے اثرات سے قادر ولی بھی بچ نہ سکتے تھے، چنانچہ اس مثنوی میں جگہ جگہ ان اثرات کی جھلکیاں ملتی ہیں، چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

مراٹھا: اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ قادر ولی کو اپنی زندگی کے لمبے سفر میں جن مقامات سے گزرنا پڑا تھا ان میں دو مقام گوالیار اور تنجاور تھے اور یہ دونوں ہی ریاستیں اس عہد میں مراٹھوں کے زیر اقتدار رہیں۔ گوالیار ایک قدیم ہندو ریاست ہے جو آج مدھیہ پردیش کا حصہ بن گئی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے سب سے پہلے اس کو فتح کیا، پھر کچھ دنوں یہ راجپوتوں کے زیر اثر رہی، آخر سنہ ۱۷۵۱ء میں مراٹھوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور پھر سنہ ۱۷۷۱ء کے بعد یہ علاقہ سندھیا خاندان کا ایک مستقل ہیڈ کوارٹر بن گیا۔

قادر ولی اور شاہ محمد غوث گوالیاری کی ملاقات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مثنوی نگار نے اس مثنوی میں واضح کیا ہے کہ شاہ محمد غوث گوالیاری پہلے دہلی کے قرب وجوار میں رہتے تھے، ان کا گھر وہیں ایک رجواڑہ کے اندر تھا اور وہ اپنے مریدوں کے ساتھ ہنسی خوشی وہاں زندگی گذارتے تھے، لیکن بدقسمتی سے راجا کی لڑکی ان کے کسی مرید پر عاشق ہوگئی اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملنے لگے،

راجا کو پتہ چلا تو اس نے نہ صرف یہ کہ ان سارے لوگوں کو اپنے رجواڑے سے باہر نکل جانے کا حکم دیدیا بلکہ جب وہ نکلنے لگے تو انکے پیچھے فوج بھی لگادی، یہ فوج مراٹھوں کی تھی، لکھا ہے:

یکایک مرہٹے کی دھوم سن آئی　　بلا کی دھوم اور آفت مچائی
جناب خواجہ دل میں ہو مکدر　　چلے واں سے مریداں ساتھ لیکر
چلے جنگل کو جب سب ہو مسافر　　لگایا فوج ان کے پیچھے کافر
ہزاروں مرہٹے کے آکے اسوار　　لیے اس قافلہ کو گھیر یک بار
ستم کرنے لگے حد سے زیادہ　　کیے خواجہ کی بیٹیوں کا ارادہ
کہا خواجہ نے کر حق پر توکل　　کہا غصے سے یا مرّیخ اُقتل
پڑے صحرا میں یکدم سر کٹے سب　　وہاں سے مرہٹے تب مرمٹے سب
وہاں سے کافروں پر فتح پاکر　　گوالیار کی ریاستی میں جاکر

گوالیار کی طرح تنجاور بھی ایک قدیم ہندو ریاست ہے جو آج ٹامل ناڈو کا ایک حصہ بن گئی ہے، جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ شیواجی نے اپنی زندگی ہی میں مغربی اور جنوبی ہند کے متعدد علاقے فتح کر کے وہاں مراٹھا حکومت کا جھنڈا لہرا دیا تھا، اس حکومت کا ایک سرا پونا میں تھا تو دوسرا تنجاور میں، تنجاور میں شیواجی کے سوتیلے بھائی ایکوجی کی حکومت تھی جو ایکوجی کی موت کے بعد اسکی اولاد میں جاری رہی۔

تنجاور کے سلسلہ میں مثنوی نگار نے صرف ایک ہندو راجہ کا ذکر کیا ہے، مراٹھا راجا یا مراٹھوں کا نہیں، مگر چونکہ قادر ولی کا زمانہ مراٹھوں کے عروج کا زمانہ تھا

اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تنجاور کے جس ہندو راجا نے قادر ولی کو ناگور میں بسنے اور اپنا مشن جاری رکھنے کی اجازت دی وہ یقیناً مراٹھا راجا ہی ہوگا۔ بقول مثنوی نگار:

کمارا جاز میں سب اپنی بوجو ۔۔۔ جہاں ہووے پسند طبع واں رہیو

سکھ: مثنوی میں سکھوں کا ذکر زیادہ نہیں ہے، صرف ایک جگہ ہے اور وہ بھی مانکپور کے سلسلے میں قادر ولی کی کرامت کے طور پر اور اس زمانہ کی مناسبت سے جب قادر ولی ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے، مگر یہ ایک حوالہ بھی یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ سکھوں اور جاٹوں نے اس زمانہ میں شمالی ہند میں کس قدر لوٹ مار مچا رکھی تھی، لکھا ہے:

ہیئے نو ہوئے اس حمل کے جب ۔۔۔ بتایا خرق عادت یک عجب تب
کہ مانکپور میں آ کر سکھ اور جاٹ ۔۔۔ لگے ہیں لوٹنے کو شہر اور ہاٹ
بقوم ہندو سے مشہور تھے وہ ۔۔۔ بڑے ظالم بہت مغرور تھے وہ
مچائے ہر طرف ظلم اور شرارت ۔۔۔ کیے بھوتوں کا مال اسباب غارت
تب اس بی بی نے دیکھ اس شور و شر کو ۔۔۔ کئی ہے بند اپنے گھر کے در کو
اسی حیرت میں تھی غلطاں کہ اس آن ۔۔۔ ہوا ایک غازی دیں واں نمایاں
نکل گھر سے گیا باہر شتابی ۔۔۔ کیے دشمن کی تا خانہ خرابی
کیا حملہ جو یک دم شیر شرزہ ۔۔۔ پڑا ہے کافروں کے تن میں لرزہ

فرنگی: مثنوی میں قادر ولی کی کرامات کے سلسلے میں ایک جگہ فرنگیوں کا بھی ذکر ہے، لکھا ہے، ولایت سے ایک جہاز ہندوستان آرہا تھا، جب وہ

ناگ پٹن کے قریب پہنچا تو اس کے پیندے میں سوراخ ہو گیا اور پانی بھر جانے کی وجہ سے وہ ڈوبنے لگا، جہاز کے سب لوگ گھبرائے، اس میں ایک مسلمان خلاصی بھی تھا، اس نے جہاز کے مالک سے کہا، اگر تم اپنے دل میں قادر ولی کی نیت کر لو تو تمہارا جہاز بچ سکتا ہے، اس نے ایسا ہی کیا اور جہاز صحیح سلامت کنارے سے آن لگا۔

پتہ نہیں یہاں مثنوی نگار کی 'فرنگی' سے یورپ کی کون سی قوم مراد ہے کیونکہ اس زمانہ میں یہاں تجارت کے نام پر ڈچ، پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی سرگرم عمل تھے، اور ہندوستانی ہر یورپین کو فرنگی ہی سمجھتے ہیں، قرین قیاس یہ ہے کہ فرنگی سے یہاں مراد یقیناً فرانسیسی ہی ہوں گے کیونکہ ناگ پٹن جہاں اس کرامت کے ظاہر ہونے کا ذکر ہے پانڈیچیری سے قریب ہے اور یہ علاقہ آزادی سے پہلے ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات میں شمار ہوتا تھا، واقعہ دلچسپ ہے، اس کے کچھ شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ولایت سے جہاز آیا تھا یک بار ۔۔۔ ہوا پیندے سے آب اس کے نمودار
بہت وہ ناؤ والے دل میں گھبرائے ۔۔۔ نہایت ڈوبنے کا خوف و غم کھائے
تھا اس میں یک خلاصی جو مسلماں ۔۔۔ کہا اس ناؤ کے مالک سے اُس آن
کہ اب قادر ولی کی کر تو نیت ۔۔۔ کریں گے دور اس آفت کو حضرت
پکارا اس نے تب قادر کو رو کر ۔۔۔ رہا کشتی کا پانی بند ہو کر
کیا بارے کرم فضل مہیمن ۔۔۔ وہ کشتی آکے پہنچی ناگ پٹن
سنے ہیں جب نصاریٰ یہ کرامت ۔۔۔ نہایت ہو گئی ہے ان کو حیرت

فرنگی مل کے سب اور نذر دے کر ہووے حاضر ادب سے پیش سرؤ
حضور شہ جو آئے ڈر کے سالے ادب کے داب سے ٹوپی اتالے
پھر اس دن سے فرنگی ہو کے قائل دل و جاں سے ہوئے حضرت کے مائل
کٹا کے ایک جا جھاڑی و جنگلا بنائے یک کنواں اور ایک بنگلا
ہے اب تک وہ وہاں پائیں درگاہ وہی بنگلا ہے قائم اور وہی جاہ

قادر ولی کی ایک اور کرامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناگور کے قریب ملاخی نام ایک جزیرہ تھا شاید وہاں فرنگیوں کا سکہ چلتا تھا، ایک دن وہاں کا ایک نامور صراف ترمل سیٹھ جعلی سکے بنانے کے جرم میں پکڑا گیا، بات کونسل اور کورٹ کچہری تک پہنچی، آخر اس کو موت کی سزا سنا دی گئی، سیٹھ اپنی موت کی سزا کا فیصلہ سُنکر کانپ گیا اور منت مانی کہ اگر میں بچ گیا تو قادر ولی کی بارگاہ میں ایک جہاز بھر کر صندل اور کتھیل نذر دے جاؤں گا، اس کی یہ منت قبول ہوئی، قادر ولی فرنگیوں کے خواب میں آئے اور انھیں دھمکی دی کہ اگر تم نے اس سیٹھ کو ذرا بھی نقصان پہنچایا تو تمھیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، فرنگی گھبرائے، سیٹھ کی سزا کا محضر نامہ منگوا کر دیکھا، لکھا تھا، اس کو رہا کر دو، اس سلسلہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ملاخی کا جزیرہ ہے جو معمور تھا ترمل سیٹھ واں صراف مشہور
کئی ہُن جھوٹے سکے کے بنایا تغلب سے اسے ہر جا چلایا
پڑی اس بات کی ہر یک جگہ دھوم ہوا اس شہر کے حاکم کو معلوم
اسے پکڑا منگا کر طوق و زنجیر کیا ہے قید میں رکھ اسکو دل گیر
تمامی کورٹ اور کمیٹی کے جرجہ لکھے ہیں قتل پر پھر اس کے محضر

تب اس صراف نے دیکھ ایسی حالت کیا قادر ولی کی دل سے نیت
کہا گر میں بچوں گا اس بلا سے تو بھیجوں گا اسے نذر اس جگا سے
جہاز یک صندل و کتھیل سے بھر روانہ میں کروں گا جلد اودھر
فرنگیوں کے بھی سپنے میں جا کر فقیر اس طور سے بولا ڈرا کر
کہ یہ سیٹھ ہی نفر ہے گا ہمارا ستم اس کا نہیں ہرگز گوارا
نہ چھیڑو اس کو تم دیکھو خبردار کیا پاؤ گے گر دیویں گے آزار
اٹھا ہر یک فرنگی نیند سے ڈر منگا کر قتل کا دیکھے ہیں محضر
لکھا تھا یہ کہ اس کو چھوڑ دینا خطا کا اس کے کچھ بدلہ نہ لینا
سحر اس حال سے ہو کر خبردار ہوئے حیراں فرنگی واں کے یکبار
خطا صراف کی کر عفو چھوڑے دغابازی کے تھاں سالے توڑے

سماجی پہلو: مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں راجوں مہاراجوں کا راج تھا، اور ان کی پرجا ہندو کہلاتی تھی۔ ہندو کون ہیں، ان کا دین و مذہب کیا ہے، خدا اور بھگوان کا ان کے یہاں کیا تصور ہے، یہ بات آج تک دودھ اور پانی کی طرح الگ نہ ہو سکی البتہ جب ہم یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا انکے عقائد و اعمال کے اعتبار سے مقابلہ کرتے ہیں تو اتنی بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسلمان "وحدت" کے قائل ہیں اور انکے دین کا سارا دار و مدار ایک خدا، ایک رسولؐ اور ان دونوں کے احکام پر ہے جب کہ ہندو کثرت میں یقین رکھتے ہیں اور سمتیں مقرر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سماجی زندگی "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کی تصویر بن گئی ہے۔

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کو اپنے سفر کے دوران میں یا جگہ جگہ قیام کے موقع پر یہاں کی جس سماجی زندگی کا سامنا کرنا پڑا وہ بڑی پیچیدہ اور اکثر حالات میں ناقابل فہم تھی۔ کہیں جنگلوں اور پہاڑوں میں جوگی اپنی اپنی تپسیا میں مصروف تھے، کہیں ایسے مہادیو براجمان تھے کہ جن کے ایک اشارہ پر ان کا دیو تالاب کا تالاب پی ڈالتا تھا، کہیں یہ رواج تھا کہ ہر سال گاؤں کی ایک نہایت ہی حسین اور جوان لڑکی سنوار سنگار کر کے گاؤں کے مندر پر قربان کر دی جاتی تھی، کہیں یہ حال تھا کہ جب گاؤں کی ندی میں باڑھ آتی تو راتوں میں بھوت اپنے سروں پر جنگلی پھولوں سے سجے ہوئے گھڑے لے کر ایسا ڈراونا ناچ ناچتے کہ سارا گاؤں سہم جاتا تھا، کہیں ایسے سادھوؤں کا راج تھا جو اپنے جادو منتر سے لوگوں کو خوفزدہ کرتے اور ان کا مال اڑا لیجاتے تھے، غرض اس مثنوی میں ایسے بیسیوں ناقابل یقین واقعات کا ذکر ہے جن کی تفصیل میں جانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

دینی پہلو: غیر مسلم طبقوں میں عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور جہاد سے مراد قتل و غارت گری ہے، اس کی موافقت یا مخالفت میں دلائل پیش کرنا اس وقت ہمارا مقصد نہیں، ہاں اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کم از کم ہندوستان کی حد تک یہ بات درست نہیں کیونکہ یہاں جن مسلم حکمرانوں نے حکومت کی وہ یا تو ترک تھے یا مغل، جہاں تک ترک سلاطین کا تعلق ہے انھیں ذاتی طور پر اسلام سے جو بھی محبت یا دلچسپی رہی ہو، انھوں نے اس دلچسپی کو اپنی رعایا پر کبھی تھوپنے کی کوشش نہیں کی، یہی کچھ حال تقریباً مغلوں کا بھی تھا، ان کی دلچسپیاں بھی اسلام کے ساتھ صرف اپنے انفرادی عمل تک محدود رہیں

اسلام کو یہاں عام کرنا کبھی ان کا مقصد نہیں تھا، اورنگزیب کو اس معاملہ میں ضرور بدنام کیا جاتا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ یہ شوشہ انگریزوں کا چھوڑا ہوا ہے جس پر ہم وحی سمجھکر ایمان لے آئے ہیں، ہندوستان میں تقریباً ساڑھے چھ سو سال مسلمانوں نے حکومت کی ہے اگر اسلام واقعی تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا تو یہ مدت یہاں کی ساری رعایا کو مسلمان بنانے کیلئے کافی سے زیادہ تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسقدر طویل عرصہ تک حکومت کر کے بھی آج مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں اور مظلوم بھی۔

ہندوستان میں اسلام کو پھیلانے کا سہرا اگر واقعی کسی کے سر ہے تو وہ ہمارے اولیائے کرام ہیں، انکی زندگی کا واحد مقصد دین اسلام کی تبلیغ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی زندگیاں تج دیں، دور دراز مقامات کا سفر کیا، بھوکے پیاسے رہے، زمین پہ سوئے، کانٹوں پہ چلے، ہر قسم کی مخالفت کا سامنا کیا، غرض کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ جھیلی ہو، مگر ان ساری مصیبتوں کے باوجود انکے عزم و استقلال میں ذرا فرق نہ آیا وہ مسلسل اپنے ایمان، عمل اور حسن اخلاق سے یہاں کے لوگوں کے دل جیتتے رہے اور انھیں اپنا ہمسفر بناتے رہے:

ہم اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل مگر
لوگ آتے ہی رہے اور کارواں بنتا گیا

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کی زندگی کا مقصد بھی بس دین اسلام کی اشاعت تھا اسی مقصد کو لیکر وہ شمال سے جنوب میں آئے اور زندگی بھر اپنے اس مشن کو جاری رکھا، مثنوی نگار نے قادر ولی کے ان دینی کارناموں کو اپنی اس مثنوی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور انھیں انکی کرامات قرار دیا ہے، قادر ولی کی یہ کرامات کیا تھیں اور ان کرامات کا اثر کیا ہوا یہ سب مثنوی پڑھ کر ہی معلوم کیا جا سکتا ہے البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کل کے صوبہ مدراس اور آج کے ٹامل ناڈو میں اسلام کا جو کچھ بول بالا نظر آتا ہے وہ قادر ولی جیسے بزرگوں کی دین ہے کسی مسلم حکمران کی تلوار کی نہیں۔

۱ـ TANJORE GAZETTEER. HEMINGWAY, MADRAS, 1906. P61, 243-

علی گڑھ کا سفر اور یوم مولانا آزاد

از ضیاء الدین اصلاحی

لکھنؤ اور بنارس کے سفر سے ۵-۶ مارچ کی درمیانی شب میں اعظم گڑھ واپس آیا تو ڈاک میں پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ کا یہ مکتوب ملا کہ "۱۱ مارچ کو لکھنؤ کی مولانا آزاد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یوم مولانا آزاد منایا جا رہا ہے جس کا صرف ایک دن کا پروگرام ہوگا اور ہر مقرر یا مقالہ نگار کو صرف پندرہ منٹ اپنے خیالات پیش کرنے کے لیے دیے جائیں گے ضابطہ کے دعوت نامہ میں دو ایک دن لگ جائیں گے اس لیے قلت وقت کے پیش نظر نجی طور پر اطلاع دے رہا ہوں"۔

۶ مارچ ہی کو ضابطہ کا دعوت نامہ آگیا جس میں بھی انصاری صاحب نے الگ سے شرکت کے لیے مزید زور دیا تھا۔ ان کے اصرار کے علاوہ علی گڑھ کا سفر میرے لیے اس لیے بھی پرکشش تھا کہ عرصے سے اپنے مخدوم و مکرم نواب مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی سے ملاقات کا موقع نہ نکال سکا تھا جو پچھلے دنوں علیل تھے، علاوہ ازیں علی گڑھ کے بھیانک فسادات کے بعد ان کی مزاج پرسی بھی نہیں کر سکا تھا چنانچہ قدرے لیت و لعل کے بعد علی گڑھ جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

۱۰ مارچ کو جناب ابو محمد صاحب ایڈوکیٹ جون پور نے اپنے یہاں مدعو کر رکھا تھا اس لیے فجر بعد ہی مرزا محمد شاہد بیگ (شبلی کالج) اور اپنے بچے

محمد طارق کے ہمراہ ان کے یہاں کے لیے روانہ ہوا اور ان کے پرتکلف ظہرانہ میں شرکت کے بعد اسٹیشن گیا، محمد طارق کی مستعدی سے بروقت رزرویشن ہو گیا اور ۱۱ مارچ کو صبح ۸ بجے علی گڑھ پہنچ گیا، ویٹنگ روم میں کچھ وقت گزارنے اور نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد حبیب منزل پہنچا تو وہاں سناٹا تھا برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ نواب صدر یار جنگ کے دولت کدے ہی پر علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ وغیرہ بھی فروکش ہوتے تھے بے اختیار امرؤ القیس کے معلقہ کا یہ مصرعہ یاد آگیا ع قفا نبک من ذکری حبیب و منزل؛ انہی خیالات میں محو تھا کہ نواب مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر تشریف لائے اور غیر متوقع طور پر مجھے دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔

ناشتہ کے بعد پروفیسر ریاض الرحمان شروانی کے ساتھ ۹ $\frac{1}{2}$ بجے جلسہ گاہ پہنچا، باہر کے لوگوں میں میرے علاوہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جناب عبد اللطیف اعظمی (دہلی) اور پروفیسر رضی الدین (ریٹائرڈ بنارس ہندو یونیورسٹی) بھی تشریف لائے تھے، جلسہ کا پروگرام عجلت میں بنا تھا جس کا اثر حاضرین کی تعداد پر پڑا مگر مقالے پر حاصل اور تقریریں پُر مغز تھیں۔ افتتاحی جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد نسیم فاروقی وائس چانسلر نے کی، مقالات اور تقریروں کے دونوں جلسے بالترتیب پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی صدارت میں ہوئے۔ پروگرام کا خاتمہ پرتکلف عصرانہ پر ہوا جو مولانا آزاد کے "صدیق مکرم"

مولانا حبیب الرحمان شروانی مرحوم کی قیامگاہ پر تھا۔ پروفیسر محمد اقبال انصاری، پروفیسر عثمان ادہمی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی کوششوں سے پروگرام دلچسپ اور کامیاب رہا۔

۱۲ مارچ کو سب سے پہلے مولانا تقی امینی کی تعزیت کے لیے ان کے مکان گیا۔ پھر ۱۲ اور ۱۳ کا دن پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر نذیر احمد، حکیم سید ظل الرحمان ندوی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی سے ملاقات اور گفتگو میں گزرا، نظامی صاحب اور حکیم صاحب نے اپنے اپنے کتب خانوں کے نوادر، مخطوطات اور اہم مطبوعات دکھائے۔ پروفیسر مختار الدین کا کتب خانہ اس سے پہلے دیکھ چکا تھا، پروفیسر نذیر احمد اور حکیم سید ظل الرحمان نے اپنی بعض تصانیف ہدیہ کیں،

پروفیسر آل احمد سرور نے وعدہ کیا کہ وہ اکتوبر میں مولانا شبلیؒ پر توسیعی لکچر دینے کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائیں گے نواب صاحب اور ان کے صاحبزادے مولوی ریاض الرحمن شروانی کی عنایتوں سے تو زیر بار ہوں ہی۔ ڈاکٹر یٰسین مظہر، ڈاکٹر ظفر الاسلام (ادارۂ علوم اسلامیہ) ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (شعبہ عربی) اور مولوی مشتاق احمد تجاروی (ادارۂ تحقیق و تصنیف) کا بھی شکرگزار ہوں کہ اکثر ساتھ ساتھ رہے اور خلوص و محبت سے پیش آئے۔ ۱۴ کو مولوی حاجی عین الحق اعظمی مالک نیو لائٹ ٹیلرز کانپور کی عیادت کے لیے رکا اور ۱۵ کو اعظم گڈھ واپس آگیا۔ فللہ الحمد

اخبار علمیہ

اسلامک فاؤنڈیشن، بنگلہ دیش کا ایک فعال ادارہ ہے، اس نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے تقریباً ۱۴۰۰ کتب و رسائل کو بنگالی زبان میں منتقل کرکے شایع کیا ہے، مساجد میں لائبریریوں کے قیام کی مفید تحریک بھی فاؤنڈیشن کی بدولت چل پڑی ہے، چنانچہ بنگلہ دیش کی دو لاکھ مساجد میں سے تقریباً پانچ ہزار مسجدوں میں دارالمطالعہ قائم ہوچکے ہیں، اب اس ادارہ نے بنگالی زبان میں ۲۴ جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان اسلامی انسائیکلوپیڈیا شایع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کی آٹھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور دو عنقریب شایع ہونے والی ہیں، اس پورے منصوبہ کا ایک خلاصہ دو جلدوں میں پہلے ہی پیش کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ و سائنس، تاریخ ممالک و بلدان اور فقہ و قضا جیسے اہم موضوعات پر علماء و محققین کی ایک جماعت ریسرچ اور تحقیق میں مشغول ہے، مقالات پر نقد و بحث کے لیے دو اعلیٰ کمیٹیاں بھی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت اس مفید کام کی تکمیل میں فاؤنڈیشن کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔

بنگلہ دیش کی یہ خبر بھی فرحت اثر ہے کہ وہاں کا اسلامی بینک ترقی، کامیابی اور سودمندی کی راہ پر گامزن ہے، یہ بینک سنہ ۸۳ء میں قائم ہوا تھا، اب پورے ملک میں اسکی ۵۰ شاخیں وجود میں آگئی ہیں جن میں ۸۰۰ افراد کام کر رہے ہیں، سنہ ۸۹ء کے اختتام پر اسکی ایک مفصل روداد میں بتایا گیا ہے کہ اس کی بے باقی رقم

۸۰ ملین ٹکا ہے، جبکہ ریزرو فنڈ میں ۶۴ ملین ٹکا موجود ہے، ۸۸ء میں بینک کا
انوسٹمنٹ ۲۰.۷۳ ملین ٹکا تھا جو ۸۹ء میں ۲۲۹۹ ملین ٹکا ہو گیا یعنی اس میں
۱۱٪ اضافہ ہوا، ۸۹ء میں بینک کی ڈپازٹ رقم ۳۴۵۵ ملین ٹکا بتائی گئی
ہے جو سال گذشتہ کے مقابلہ میں ۲۲٪ فیصد زیادہ ہے، اسی سال اس نے رقم
جمع کرنے والوں میں تقریباً ۷.۵ ملین ٹکا تقسیم کیے، پی ایل ایس سیونگ ڈپازٹ
کی شرح آمدنی ۹٪ بتائی گئی ہے جبکہ رقم جمع کرنے والوں کو ۳۶ مہینوں کے متعین
وقت میں جو منافع ہوا اس کی شرح ۱۲.۵٪ ہے مجموعی لحاظ سے ۸۹ء میں بینک کو
۲۸۵ ملین ٹکا کا منافع حاصل ہوا جبکہ ۸۸ء میں یہ ۲۳۲ ملین تھا، یہ بینک ۱۱۷
صنعتی منصوبوں کو مالی امداد بھی فراہم کرتا ہے اور فارن ایکسچینج بزنس میں اس کی ۸۵.۴
ملین ٹکا کی رقم لگی ہوئی ہے۔ دو ٹکا ایک ہندوستانی روپیہ کے مساوی ہے

اسلامی بینک کاری کی یہ مساعی پاکیزہ اور بابرکت بھی ہیں اور سودی بینک کاری
کے زہر کا تریاق بھی ہیں، ایسا ہی ایک ادارہ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ بھی ہے
جس کا ایک شعبہ اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ۸۱ء سے قائم
ہے، اسلامی اقتصادیات، معاشیات، بینک کاری اور مالیات کے متعلق شریعت مطہرہ
کی تعلیمات اور ہدایتوں کے مطابق تحقیق اس کا خاص مقصد ہے، چنانچہ وقتاً فوقتاً
اس کی جانب سے مذکورہ موضوعات پر رسائل وکتابیں شایع ہوتے رہتے ہیں حال
ہی میں اس کی جانب سے انگریزی زبان میں ایک رسالہ شایع ہوا ہے جو مسلم
ممالک میں زمین کے حق ملکیت اور حق لگان پر ہے، ڈاکٹر ایم، اے جلید (JULA
ه) کے اس وسیع مقالہ کی قدر وقیمت کا اندازہ مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے تاہم

چند سرخیاں یہاں درج کی جاتی ہیں، مسلم ممالک کی زمیندارانہ ساخت، زمین کی ملکیت،
اسکے احکامات تقسیم وتفریق زمینداری کے نتائج کی مختلف شکلیں، انکی حدبندیاں نئی
زمینداری اور حق لگان اصلاحات زمینداری، جدید زمیندارانہ اقتصادیات، اسلام
پر مبنی اصلاحات کی قوت وحرکیت، مشترکہ نظام، عوامل فیض رسانی، قرآن وسنت سے
دستوری رہنمائی، اسلامی قانون وراثت، اجتماعی نظام کا تعین وغیرہ، انکے علاوہ بعض اہم
فقہی اصطلاحات کی انگریزی تشریح اور افریقہ ومغربی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں
زمینداری اور وقف وغیرہ کے متعلق نہایت اہم اور جدید ترین چارٹ بھی دیے گئے ہیں۔

عراق وکویت کی جنگ ام المعارک، تباہیوں اور بربادیوں کی نئی داستانوں کو جنم دے کر
ختم ہو گئی، اب ہلاکتوں اور نقصان کے تخمینوں اور نئے امکانات کے تجزیوں کی باتیں ہو رہی
ہیں، عبرت کے در بھی وا ہیں لیکن صرف اولی الابصار کے لیے، پہلے بھی ان کالموں میں لکھا
گیا تھا کہ مغربی طاقتیں محض فوج واسلحہ ہی نہیں، علمی میدانوں میں بھی ساری دنیا اور خصوصاً
مشرق وسطی کو اپنی محنت، جانفشانی اور تحقیق کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں، حال ہی میں
کناڈا کے مسلم اخبار کریسنٹ انٹرنیشنل کے دو شمارے آئے تو نئی کتابوں کے کالم میں دیکھکر
تعجب ہوا کہ مغرب کس قدر مستعدی اور تسلسل کے ساتھ مشرق وسطی پر اپنی علمی توجہ مبذول کیے
ہے، ایک کتاب BEHINDTHEMYTH یاسر عرفات اور فلسطینی تحریک پر ہے ۳۵۶
صفحات کی اس کتاب میں اینڈریو گاور ٹونی واکر نے یاسر عرفات کے بچپن سے تحریک انتفاضہ
تک کے حالات کا استقصا کیا ہے، امریکہ سے زیو شیف اور ایہود یاری نے انتفاضہ پر ایک
مفصل کتاب شایع کی ہے فلسطینیوں پر ایک اور کتاب SANCTUARY ANDSURVI
VALTHEPLOINLEBANON شایع ہوئی ہے جسے میک گل یونیورسٹی کے شعبہ
مطالعات مشرق اوسط کے چیرمین رکس برینن نے مرتب کیا ہے، خلیجی ریاستوں پر لندن سے

ایک اور اہم کتاب STATE AND SOCIETY IN THE GULF شایع ہوئی ہے یہ خلدون حسن النقیب کی اس کتاب کا جدید اڈیشن ہے جسے سنہ[illegible]ء میں پہلی بار شایع ہونے پر کویت میں ممنوع قرار دیا گیا تھا، آکسفورڈ سے مصر اور اسکی خارجہ پالیسی پر تازہ کتاب نکلی ہے اور واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر پڈرو رامٹ کی ایک کتاب شام و روس تعلقات کے متعلق شایع ہوئی ہے جس میں سنہ ۵۵ء سے ان دونوں کے تعلقات کے نشیب و فراز کا مطالعہ و تجزیہ ہے، کریسنٹ کے صرف دو شماروں میں درج ان کتابوں کے بارے میں اطلاعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میدان جنگ کے علاوہ کارزار علم میں بھی مغرب کتنا متحرک اور توانا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں جہاں کتابیں بکثرت شایع ہوتی ہیں انکے قارئین کی تعداد بھی کم حیرت انگیز نہیں خلیجی جنگ کے دوران وہاں خلیج اور عرب سے متعلق کتابوں کی اشاعت و فروخت تیز تر ہو گئی، جن کتابوں نے فروخت کے نئے معیار قائم کیے ان میں ڈینررٹ شیلڈ (برکلے پبلیکیشنز) ریپبلک آف فیر (پنتھین بکس) صدام حسین اینڈ دی کرائسس ان دی گلف (ٹائمز بکس) اور دی ریپ آف کویت (نائٹ برج پبلشنگ کمپنی) نمایاں ہیں، مؤخر الذکر کتاب کی ۱۲ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں اور اب عالم ہے کہ نیویارک کے کتب فروشوں کے پاس اسکی ایک کاپی بھی نہیں، صدام حسین اینڈ دی کرائسس کے ۴ لاکھ سے زیادہ نسخے شایع ہوئے اور سب ختم ہو گئے اور اب اسکا نیا اڈیشن بھی شایع ہو گیا ہے، ڈینررٹ شیلڈ کے ناشر کو امریکہ کے نائب صدر کا فون ملا کہ اسکی ایک کاپی انہیں فوراً بھیجی جائے۔

خاک و خون کی ان داستانوں میں یہ دلچسپ خبر بھی ہے کہ عین جنگ کے زمانہ میں سعودی عرب نے جرمنی کو ایک معاہدہ کے مطابق ایک لاکھ پچاس ہزار تازہ پھول برآمد کیے، وادی تبوک کے گلشنوں کے یہ پھول ۴ ملین کی تعداد میں بھیجے جائیں گے، یہ لالہ صحرائی اپنی تازگی، خوشبو اور دیدہ زیبی کی وجہ سے اور ممالک پر سبقت لے گئے۔

ع۔ص

معارف کی ڈاک

ضروری تصحیح

ناظمہ منزل علی گڑھ۔
یکم مارچ سنہ ۱۹۹۱ء

محترمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم

ایک خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ معارف (فروری) کا شمارہ مل گیا تھا، ایک امر کی تصحیح ضروری ہے، براہ کرم مارچ کے شمارے میں کہیں پر شایع کر دیجئے۔ یہ ضروری ہے اسی لیے اسے رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

معارف (فروری) میں قاضی سجاد حسین کی وفات پر ایک نوٹ شایع ہوا ہے اس میں مرحوم کی سات تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، اس عرصے میں ان کی ایک کتاب اخلاق محسنی (مترجم) میرے کتابخانے میں نکل آئی جسے انھوں نے دہلی میں، ۳۰ مئی سنہ ۶۷ء کو مجھے اپنی دوسری تصانیف کے ساتھ مرحمت فرمایا تھا، یہ ۳۰۳ صفحوں کی کتاب ہے فارسی کی ہر سطر کے نیچے اردو ترجمہ درج ہے، سال طبع درج نہیں لیکن قمر سنبھلوی کے قطعۂ تاریخ سے ۱۲۸۴ کے اعداد متخرج ہوتے ہیں اور اس کتاب پر جو شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ کا پیش لفظ ہے وہ ۲۵؍ اگست سنہ ۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ سال طباعت سنہ ۶۴ء سمجھنا چاہیے۔

دوسری کتاب پندنامہ (محشی) ہے، یہ پہلی کتاب سے کچھ پہلے چھپی ہوگی،

اس لیے کہ اخلاق محسنی کے آخر میں اس کا اشتہار درج ہے۔ دونوں کتابیں قاضی صاحب مرحوم ہی کے ادارے سب رنگ کتاب گھر، گلی قاسم جان دہلی سے شایع ہوئی ہیں۔ اس طرح قاضی سجاد حسین مرحوم کی تصانیف کی تعداد ۹ تک پہنچی ہے۔

(۲) معارف ص ۱۵۳ - ابراہیم بن محمد نام کے دو مصنف حلب میں گزرے ہیں، ایک محمد بن ابراہیم تو یہی سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں، دوسرے ابراہیم بن محمد، متاخر العہد ہیں اور ملتقی الابحر اور غنیۃ المستملی کے مصنف جو بحیثیت عالم و مصنف مقدم الذکر کے مقابلے میں شہرت نہیں رکھتے۔ انھوں نے استانبول میں ۹۵۶ھ میں وفات پائی۔ فتاوی التاتارخانیہ کی تلخیص الفوائد المنتخبہ انہی بزرگ کی کی ہوئی ہے، برہان الدین ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمی کی نہیں۔

(۳) ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، عرصے سے مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ پر کام کر رہے ہیں، انھوں نے بڑے قیمتی معلومات ان کے بارے میں جمع کیے ہیں اور اپنے اس علمی منصوبے پر انھوں نے بہت محنت کی ہے جیسا کہ اسلام آباد میں ان سے متعدد ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہوا۔ افسوس ہے کہ کام پھیلتا گیا اور وہ اسے وقت پر سمیٹ نہ سکے۔ یہ مواد اگر شایع ہوا تو دو تین جلدوں میں آئیگا آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کا اختصار ایک مضمون کی شکل میں شایع کر دیا۔

(۴) سراج ہندی پر سید ریاست علی ندوی مرحوم نے بہت اچھا تفصیلی مضمون رسالہ ندیم (گیا) میں اپنی ادارت کے زمانے میں دو تین قسطوں میں شایع کیا تھا یہ تقسیم ہند سے پانچ سات سال پہلے چھپا تھا، تعجب نہیں کہ انکے مجموعہ مضامین میں بھی شایع ہوا ہو۔[1]

[1] عہد اسلامی کا ہندوستان کے نام سے جو مجموعہ دارالمصنفین پٹنہ سے شایع ہوا تھا اس میں یہ مضمون شامل نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ ایسے اہم عالم و مصنف پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن تو درکنار اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور) میں بھی کوئی مضمون شریک اشاعت نہیں۔ عارف عمری صاحب نے کسی حد تک یہ کمی مضمون لکھ کر پوری کردی، ورنہ پچاس سال پہلے کا ندیم کا شمارہ اب کہاں کسی کو دستیاب ہوگا۔

(۵) مولانا کوکن صاحب مرحوم پر حافظ عمیر صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے اور پُر معلومات، یہ صرف "وفیات" پر مختصر مضمون نہیں ہے بہت مکمل مقالہ ہے، اس لیے اس پر فی الحال کسی مضمون کی اشاعت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس سے یہ نہ سمجھیے کہ کوکن مرحوم یا معارف میں میری دلچسپی کم ہوگئی ہے مرحوم سے میرا گہرا تعلق تھا اور ان پر مضمون لکھ کر میں دوستی اور محبت کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں، ایسا حق کہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کرسکتا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے

والسلام خیر طلب: مختار الدین احمد۔

خلیج کی جنگ

خلیج کی جنگ ختم ہوگئی مگر اس کی آگ میں ابھی تک مسلمان جل بھن رہے ہیں، اس جنگ نے دردمند مسلمانوں کو جو غم و اضطراب دیا ہے اس کا اندازہ اصحاب علم ونظر کے مندرجہ ذیل خطوط سے ہوسکتا ہے۔

اپنے مفاد اور اسرائیلی حکومت کی مضبوطی و استحکام کے لیے برطانوی اور امریکی استعمار عرب ملکوں کو اپنی مکمل گرفت میں لے کر اور عراق کے حصے بخرے کر کے ہی دم لےگا، اگر عرب ممالک سامراج فرنگ کی اس سازش کو سمجھ لیتے تو خود ہی اپنی

قید و بند کے پھندے نہ کستے بقول اقبال سہیل مرحوم

مجھ ہی سے حلقے کسوائے مرے دام سیری کے — الٹی گیا کہوں انکی نگاہ سامری فن کو

(۱)

رائے بریلی

۶/ شعبان ۱۴۱۱ھ

محب فاضل و مکرم زیدت مکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ! عنایت نامہ مورخہ ۱۶/ فروری وقت پر پہنچ گیا، امید ہے کہ ہمارا ابھی تازہ خط ملا ہوگا، آپ نے ہماری جس تشویش و اضطراب کا اندازہ کیا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، بلکہ واقعہ اس سے بھی زائد ہے، یاد نہیں کہ ساری عمر میں کبھی بھی ایسے اضطراب کے دن گزرے ہیں، اس کی وجہ "البعث العربی" اور قومیت عربیہ کی تحریک کے علمبرداروں کے اصولوں، ارادوں اور منصوبوں سے واقفیت ہے، جو جزیرۃ العرب کو جاہلیت اولیٰ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور ساری مساعی اور انقلابات، بلکہ خاکم بدہن کار نبوت کے برکات پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں کم ہی لوگوں کو اس سے واقفیت اور اس کا براہ راست مطالعہ حاصل ہے۔ ہمارا رسالہ "اکبر خطر علی العالم العربی" آپ کو پہنچے گا، تو اس خطرہ کی سنگینی کا احساس ہوگا، ان کا اقتدار اور اشتراکی امریکنوں اور برطانویوں کے عارضی قیام اور جنگی امداد سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

(۲)

باسمہ تعالیٰ

کراچی

۲۷/ فروری ۱۹۹۱ء

مولانائے محترم زید فیوضہم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قصور وار ہوں کہ مدت سے خیریت طلبی کا عریضہ نہ لکھ سکا، حالانکہ خیال برابر آپ کی طرف لگا رہا۔ اس مرتبہ فروری کا معارف اسی مہینے میں موصول ہوا، حیرت ہوئی۔ اس کے شذرات میں خلیج کی جنگ پر آپ کا تجزیہ و تبصرہ خود اپنی فکر کی ترجمانی اور اس کا سوز و گداز خود اپنے دل میں محسوس کر کے شکر ادا کیا کہ ع متحد گردید اے بوعلی با اہرمن
دو مسلم ملکوں کی سیاسی بے بصیرتی اور خود غرضی نے ملت اسلامیہ کو کس قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔ انا للہ — از ماست کہ بر ماست

معارف کے اسی شمارہ میں اسکے "circulation" کی کمی پر بڑا افسوس ہوا، میں تو سمجھتا تھا کہ بیرون ملک کی عالمی یونیورسٹیوں میں تو یہ ضرور جاتا ہوگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طرف توجہ نہیں فرمائی گئی، ہندو پاکستان میں تو علمی و دینی ذوق جس سرعت سے انحطاط پذیر ہے اسکے ہوتے ایسے رسالوں کی کم خریداری حیرت خیز نہیں۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کے خطوط میں سے ایک دو خط جو عام افادیت کے ہوں کبھی کبھار آپ کی خدمت میں اگر ارسال کیا کروں تو آپ معارف میں جگہ دینا پسند فرمائیں گے؟

پچھلے اکتوبر میں انڈونیشیا دس بارہ دن کے لیے جانا ہوا، حالات قریب سے اور غور سے دیکھے، انا للہ ہی پڑھنا پڑا، ملت اسلامیہ پر موسم خزاں کا وقت ہے، اب تو نہ بلبل نہ گل ہی بہار لائے تو لائے،

اپنے لیے اصلاح حال اور حسن انجام کی دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام

ناچیز

غلام محمد

(۳)

حبیب منزل۔ علی گڑھ

۲۵؍۲؍۹۱ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

فروری کے معارف کے اداریے میں عراق کے حالات پر آپ نے جو تبصرہ کیا ہے اس سے دل بہت خوش ہوا۔ اس مسئلے پر اتنا متوازن اور مبنی بر حقیقت اظہار خیال اس سے پہلے نظر سے مشکل ہی سے گزرا ہوگا ورنہ لوگ افراط تفریط میں مبتلا ہیں، کسی کے نزدیک صدام حسین ہیرو ہیں اور کوئی انکی تکفیر سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو آپنے لکھی ہے یعنی ایک طرف صدام حسین کا کویت پر حملہ اور قبضہ اور دوسری طرف سعودی حکومت کا اپنی سرزمین پر امریکہ اور اسکے ساتھی ملکوں کی افواج کو جمع کرنا دونوں اتنی بڑی غلطیاں تھیں جنھوں نے مغربی طاقتوں کو اپنی من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دیدی اور ان بدبختوں کو اپنے ناپاک عزائم پورے کرنے کا موقع مل گیا۔ خود امریکہ، برطانیہ وغیرہ کا دامن جارحیت سے جیسا "پاک" ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور پھر اسرائیل کی مسلسل جارحیت کو وہ جسطرح نہ صرف برداشت کررہے ہیں بلکہ اسکی حوصلہ افزائی کا موجب بن رہے ہیں وہ بھی سامنے کی بات ہے پھر یکایک انھیں کویت سے جو ہمدردی بلکہ محبت پیدا ہوگئی اسکے اسباب سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ ساتھ ہی ان عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک کی حکومتوں کا رویہ بھی تنقید سے بالاتر نہیں جو مغربی ممالک کا ساتھ دے رہی ہیں اور انکا آلہ کار بن رہی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ تباہی بہرصورت مسلمانوں اور عربوں کی ہورہی ہے چاہے وہ کویت ہو یا عراق یا سعودی عرب سب سے زیادہ نشانۂ ستم عراق ہی بن رہا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عربوں پر اللہ تعالیٰ کے جو قدیم و جدید احسانات کیطرف آپ نے اشارہ کیا ہے انکی موجودگی میں انکا یہ طرز عمل اور زیادہ افسوسناک ہے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو عرب سلاطین نے جسطرح ذاتی تعیش و تنعم میں صرف کیا بلکہ اب بھی کررہے ہیں وہ نہایت عبرتناک ہے اللہ تعالیٰ عقل سلیم مرحمت فرمائے۔ سوویت کے انحطاط کے بعد اب امریکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت ہے۔ امید ہے آپکا مزاج بخیریت ہوگا۔ نیازمند ریاض الرحمٰن شیروانی

وفیات

مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم

از عمیر الصدیق دریابادی ندوی دارالمصنفین

دارالمصنفین میں یہ خبر نہایت غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے امیر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری، مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبر، دارالعلوم دیوبند و ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین مولانا سید منت اللہ رحمانی کا انتقال ۳ رمضان المبارک ۱۹ مارچ کی شب میں ہوگیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

ان کا مرثیہ صرف ایک عالم کا نہیں بلکہ ایک عالَم کا ماتم ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان جیسی ستودہ صفات ہستیاں اس دور قحط الرجالی میں نعمت سے کم نہیں اور اس نعمت کے چھن جانے سے حرمان و نقصان کی کیفیت اور شدید ہوجاتی ہے۔

انھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم و معرفت اور شریعت و طریقت کی دولت سے مالا مال تھا، انکے والد ماجد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے تعلق، رد عیسائیت، تحریک ندوۃ العلماء اور رد قادیانیت میں اپنے کارناموں کے سبب نمونۂ سلف اور طبقۂ علماء و مشائخ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، انکی اقامت کانپور میں تھی لیکن ہدایت وارشاد کے لیے وہ مونگیر اور اس کے اطراف

میں برابر تشریف لے جایا کرتے تھے، جب وہاں قادیانیت کا فتنہ زیادہ سنگین ہوا ہوا تو اس کا مکمل قلع قمع کرنے کے لیے ۱۳۲۰ھ میں انھوں نے مستقل طور پر مونگیر میں اقامت اختیار کی، مولانا منت اللہ رحمانی ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے اپنے بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مولانا مونگیریؒ کے انتقال کے وقت انکی عمر تقریباً دس برس تھی، ان سے بیعت تو حاصل ہوئی لیکن استفادہ کا زیادہ موقع نہ ملا، انھوں نے بعد میں دیوبند اور ندوہ میں بھی تعلیم حاصل کی، ندوہ میں وہ اپنے بھائی مولانا نور اللہ صاحب کے ساتھ آئے اور تقریباً چار سال قیام کیا، انکے زمانہ طالب علمی کے رفقاء میں مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم بھی تھے، جن کی اولوالعزمی اور شاہانہ حوصلہ نے تاج المساجد بھوپال کی تعمیر کی تکمیل پوری کر دکھائی تو مولانا منت اللہ صاحب نے بڑے پر لطف انداز میں فرمایا کہ اور کچھ ہو نہ ہو عمران خاں صاحب نے اپنی جنت تو پکی کر لی۔

ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ، مولانا عبدالرحمٰن نگرانی ندوی جیسے ارباب فضل و کمال تھے، دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، مولانا سید اصغر حسین اور مفتی محمد شفیع سے استفادہ کیا، حاجی محمد شفیع بجنوری خلیفہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں پانچ سال رہے، بعد میں وہ اپنے والد ماجد کے خلیفہ مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری سے مجاز خلافت بھی ہوئے اور اپنے برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد خانقاہ رحمانی کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔

ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ ابتدا ہی سے تھا، خوش قسمتی سے ان کو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی توجہ بھی حاصل ہوگئی جو ایک دقیقہ رس عالم و فقیہ تھے اور جنکا خیر امت کے لیے پیہم عمل، سوز و ساز، درد و داغ، جستجو و آرزو اور بے کلی بیقراری اور ایک اضطراب مسلسل سے تیار ہوا تھا، انکے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ "وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے" ان کی سرپرستی میں مولانا منت اللہ رحمانی ۱۹۳۶ء میں سہرسہ سے بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے لیکن مولانا محمد سجاد کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ امارت شرعیہ کا قیام تھا، جو دراصل ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی ذہنی حالی انتشار، احساس شکست اور قنوطیت کے خلاف نئی بیداری اور نئی شیرازہ بندی کا پیام تھی، علماء و مفکرین اس کی ضرورت سے باخبر تھے، چنانچہ ۱۹۲۰ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خیال کو پیش کیا، یورپ سے واپسی کے بعد پھر انھوں نے اس ساز کو چھیڑا لیکن ان کے بقول "اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح نہ چلنے دیا۔" تاہم مخالفتوں کے باوجود مولانا سجاد کی قوت عمل نے بہار میں اس کو وجود کا قالب بخش دیا، سید صاحبؒ نے اسے ان کی سب سے بڑی کرامت سے تعبیر کیا کہ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، نظام شرعی کے قیام کی نیت کی برکت تھی کہ اس تحریک کو ملک کے علماء و مشائخ کی تائید حاصل ہوئی، چنانچہ اپنے عہد کے جنیدؒ و شبلیؒ، مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی اور پھر بعد میں مولانا شاہ محی الدین پھلواروی، شاہ قمرالدین پھلواروی کے علاوہ مولانا مونگیری، مولانا آزاد اور مولانا عبدالصمد رحمانی

اس تحریک کی قیادت و سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی امارت شرعیہ کے چوتھے امیر تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلاف کی اس میراث و روایت کو اپنے علم و فضل رسوخ فی الدین، استقامت، فہم و فراست، اعتدال و توازن اور اعتماد و تعاون سے صرف قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسے مزید ترقی و وسعت بھی دی، گویا ان کی تنہا ذات میں پھلواری شریف کے بزرگوں اور مولانا مونگیری و مولانا سجاد کی برکات جمع ہوگئی تھیں امیر منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ایک تقریر میں "ہندوستان میں آزاد اسلام" کی جرأتمندانہ بات کہی تو مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھا کہ وہ اپنے اس مومنانہ اقدام کے لیے مستحق تبریک و تحسین ہیں"۔ آج امارت شرعیہ کے شعبہ دارالقضاء، شعبہ افتاء، بیت المال وغیرہ اپنے امیر کی کامیاب قیادت کے نقیب و شاہد ہیں۔

ان کا دوسرا روشن اور نہایت اہم کارنامہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہے، یکساں سول کوڈ کے مطالبہ نے جب زور پکڑ لیا تو اس خطرہ کی شدت و سنگینی کو محسوس کرنیوالوں میں وہ پیش پیش تھے، ان کی مساعی کی بدولت ۷۲ء میں بمبئی کے ایک بڑے اجلاس میں مسلمانوں کے مختلف حلقہ فکر کے رہنما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور انھوں نے بورڈ کی تشکیل کی جس نے شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بڑا قابل قدر اور موثر کردار ادا کیا۔ مولانا کی یادگاروں میں جامعہ رحمانی بھی ہے جسے انھوں نے ۴۵ء میں قائم کیا تھا۔ جامعہ نے فقہ و افتاء کے شعبہ میں ممتاز اور قابل ذکر علماء پیدا کیے، اس کے کتب خانہ کو بھی انھوں نے بڑی وسعت دی۔

ندوہ سے ان کو خاص تعلق تھا، اپنے والد مولانا مونگیری سے اس کے رشتہ کو

انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا، ندوہ کے ناظم اور دارالمصنفین کے روح رواں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ان کا بڑا لگاؤ اور مخلصانہ روابط تھے اکثر قومی و ملی مسائل میں دونوں کو ایک دوسرے کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل رہتا تھا ندوہ کا عظیم الشان ۸۵ سالہ جشن منایا گیا تو اس کے آخری اہم اجلاس کی صدارت انھوں نے کی اور انہی کی دعا پر یہ جشن ختم ہوا، دارالمصنفین، علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور معارف کے وہ قدرشناس تھے، علامہ شبلیؒ کے متعلق ایک جگہ لکھا کہ "وہ عالم اسلام کے مشہور عالم، ادب و تاریخ کے امام اور قدیم و جدید کے سنگم تھے" انھوں نے مولانا گیلانی کا یہ قول بھی نقل کیا کہ "بلاشبہ مولانا شبلیؒ قدیم و جدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے" اختلاف مسلک کو انھوں نے کبھی وجہ تلخی نہیں بنایا مکاتیب گیلانی کے ایک حاشیہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق انکی چند سطریں کئی صفحے پر بھاری ہیں۔

انھوں نے مقالات و مضامین کثرت سے لکھے، وقتی مسائل پر انکے رسائل بھی ہیں گو مولانا کو تصنیف و تالیف کا بھی اچھا سلیقہ تھا مگر قومی و ملی زندگی کی مصروفیتوں نے انہیں اس جانب متوجہ نہیں ہونے دیا کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط کا ایک مجموعہ مکاتیب گیلانی کے نام سے مرتب کرکے شایع کیا تھا اس میں انھوں نے مکتوب الیہ کا مختصر حال تحریر کرنے کے علاوہ مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھے ہیں اس سے مولانا کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے مولانا گیلانی کا ہر خط عمدہ معلومات پر مشتمل ہوتا تھا اسلیے مولانا منت اللہ صاحب نے ان منتشر جواہر پاروں کو شایع کرکے بڑی مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے فاضل مرتب نے قارئین کی سہولت کیلئے ہر مکتوب کی مفصل فہرست بھی شایع کی ہے

مولانا کی زندگی اپنے کارہائے نمایاں کیوجہ سے اگر قابل رشک رہی تو انکی مبارک موت بھی حسن خاتمہ اور حسن قبول کی بشارت لائی، ۲۳ رمضان المبارک کو عشاء اور تراویح کی ابتدائی چند رکعات کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اللہ تعالیٰ انکو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے انکے پسماندگان خصوصاً انکے صاحبزادہ مولانا محمد ولی رحمانی اور تمام متعلقین کو صبر و رضا کی توفیق دے اور قوم و ملت اور امارت شرعیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

مطبوعات جدیدہ

ایقان اقبال (فارسی) از جناب پروفیسر محمد منور، ترجمہ فارسی از ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری تقطیع متوسط، کاغذ، طباعت بہترین، صفحات ۲۵۲ قیمت ۸۰ روپے پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے مستند اور بالغ نظر شارحین میں پروفیسر مرزا محمد منور کا نام نمایاں ہے، ان کی ایک کتاب 'میزان اقبال' میں کلام اقبال کے ادبی پہلو کا فاضلانہ جائزہ لیا گیا تھا، ۱۹۷۷ء میں ان کی ایک اور کتاب 'ایقان اقبال' کے نام سے شایع ہوئی، اس کے مباحث کا تعلق علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے تھا مثلاً علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت، تصور تقدیر، براہیمی نظر، حیات بعد الموت، تصور ملت، مرگ مجازی اور نقد اقبالیات کے شیدائیوں میں کتاب کی پذیرائی ہوئی، اب ایران کی ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری نے اسے فارسی زبان کا قالب دے کر اقبالیات کے فارسی داں قدردانوں کے لیے ایک عمدہ علمی سوغات مہیا کر دی ہے، شروع میں ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کے مختصر تعارفی مضمون کے علاوہ خود ڈاکٹر شہین کا مقدمہ بھی خوب ہے۔

اقبال اور قائد اعظم از پروفیسر احمد سعید، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت عمدہ صفحات ۸۰ قیمت ۳۵ روپے پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور پاکستان۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کے نقوش فکر و عمل روز روشن کی طرح عیاں ہیں، دونوں ناموروں ہم عصر ابتدا میں بعض سیاسی مسائل پر مختلف الآراء تھے لیکن بعد میں دونوں کے خیالات میں اس درجہ یکسانی و ہم آہنگی ہو گئی کہ علامہ اقبال نے خود کو جناح صاحب کا معمولی سپاہی قرار دیتے ہوئے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی کہ وہ دیانت دار ہیں اور خریدے نہیں جا سکتے۔ دوسری جانب قائد اعظم نے اس پر فخر کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال کی قیادت میں ان کو ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا نیز ان کی نظر میں علامہ اقبال سے زیادہ اسلام کا شیدائی کوئی اور نہ گزرا، ان دونوں رہنماؤں کے سیاسی نظریات تعلقات و اختلافات پر جناب احمد سعید نے ۱۹۷۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا جو بعد میں چند اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شایع ہوا، زیر نظر کتاب اسی کا جدید ایڈیشن ہے، اس میں تین ابواب ۱۔ اختلافات ۲۔ خیالات میں ہم آہنگی و یکسانیت اور ۳۔ اختلافات کا خاتمہ شامل ہیں، ان کے ذیل میں سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ، سندھ کی علیحدگی، فرقہ وارانہ فیصلے، مغربی طرز جمہوریت پنجاب و بنگال کی اکثریت، فلسطین، مسجد شہید گنج وغیرہ کے بارے میں دونوں حضرات کے نقطہ نظر کا بڑی جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے جو پر از معلومات ہے، آخر میں مکاتیب اقبال بنام قائد اعظم بھی شامل کر دیے گئے ہیں ان انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ پہلے بھی شایع ہو چکا ہے مگر مولف نے زیادہ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کی کوشش کی ہے، اپنے موضوع پر یہ جامع اور پر از معلومات کتاب ہے اور اقبال اکادمی لاہور کے معیار کے عین مطابق ہے۔

نصف صدی قبل کا سفر نامہ حج از الحاج مولانا قاری حکیم محمد حمید اللہ سنبھلی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت، بہترین، صفحات ۱۱۲ قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت اور روضہ انور کی حاضری ہر مسلمان کا منتہائے شوق ہے، وادی شوق کے اس سفر کی ہر کیفیت کو یاد رکھنے اور لطف و لذت سے بیان کرنے کی مبارک روایت سے دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کا دامن بھی تہی نہیں ہے، زیر نظر سفرنامہ حج اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مولانا قاری حمید الدین سنبھلی مرحوم متوفی ۱۹۵۸ء جو فن تجوید و قرأت میں اپنے وقت کے ممتاز و یگانہ شخص تھے۔ ۱۹۳۴ء میں حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے اور مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا محمد سلیم کی فرمائش پر اپنے سوانح حیات "حمید السوانح" کی تالیف میں انھوں نے اس سفر سعادت کی پرکیف یادوں کو بھی قلمبند کیا، خوش قسمتی سے ان کا یہ مسودہ انکے ذی علم اور سعید فرزند مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دستیاب ہوا تو انھوں نے اسے اپنے مفید حواشی کے ساتھ ماہنامہ ذکر و فکر میں بالاقساط شایع کیا اور اب یہ کتابی صورت میں طبع ہوا ہے۔ پچاس برس کا عرصہ گو زیادہ نہیں لیکن موجودہ صدی میں گردش لیل و نہار نے جس تیز خرامی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا مشاہدہ اس سفرنامہ حج سے کیا جاسکتا ہے، مسافر حرم نے آرزوئے دید اور شوق وصال کی لذت و سرشاری کے ساتھ معمولی جزئیات تک سے اعتنا کرکے انہیں نہایت سادگی و دیانت سے بیان کردیا ہے سبق آموز واقعات کی جانب توجہ دلائی تو مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ پورا سفرنامہ پڑھنے کے لائق ہے، حواشی نے اس کی قدر و قیمت دوچند کردی ہے، شروع میں صاحب سفرنامہ کے مختصر حالات زندگی بھی دیے گئے ہیں، مولانا محمد مسعود شمیم مکی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی کے مقدمہ و تعارف کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے، انکے الفاظ میں یہ سفرنامہ بیک وقت شوق انگیز، معلومات خیز، دل دوز اور ایمان افروز ہے۔

(ع۔ص)

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔

۶۔ رحمت عالم۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔

۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔

۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔

۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔

۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔

۱۳۔ عربوں کی جہازرانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی)

۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی)

۱۶۔ یاد رفتگاں۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحب کے تاثرات

۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔

۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔

۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں)

۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحب کے یورپ سے خطوط کا مجموعہ۔

دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے

"منیجر"